JULY
2026

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

سالگرہ مبارک

حسن عابدی JULY 7

حمایت علی شاعر JULY 14

نورالہدیٰ شاہ JULY 22

ابنِ صفی JULY 26

فہمیدہ ریاض JULY 28

خالد احمد
ساگر کا
مبارک

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

شام اداس سروں کی خوشبو سانسوں میں رچ جاتی ہے
صبح دھڑکتے دلوں کی جھلمل آنکھوں میں بچ جاتی ہے

عشق میں جاں سے گزر جانے پر اور تو کچھ بھی نہیں ہوتا
ذکر کے گل کھلنے لگتے ہیں ، دھوم سی اک مچل جاتی ہے

کان سے دل تک آنے والی راہ میں گرد نہیں اڑتی
ظلم کی بات سفر کرتی ہے ، گھر گھر سچ سچ جاتی ہے

فکر معاش میں پھرتے پھرتے شام کو گھر آ جاتے ہیں
ایک تھکن ، جب اک دن بن کر ، نس نس میں رچ جاتی ہے

زر والوں کے ساتھ ہی خالد ، بے زر بھی اٹھ جاتے ہیں
ماہ و سال گزر جاتے ہیں ، ایک گھڑی بچ جاتی ہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37603901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - جولائی 2026 - شمارہ نمبر: 7

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب حسن عابدی، جناب حمایت علی شاعر
محترمہ نور الہدیٰ شاہ، جناب ابن صفی، محترمہ فہمیدہ ریاض

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور (پبلشر) پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد شیل پٹرول پمپ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، سید افسر ساجد، محمد افضال انجم	7 تا 10
2	نعت	نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز محمد افضال انجم، اکرم ناصر، صادق جمیل، رضا اللہ حیدر سرور حسین نقشبندی، مرزا آصف رسول	11 تا 20
3	سلام	افروز رضوی، احمد جلیل، فیض رسول فیضان، مسعود احمد عقیل رحمانی، علمدار حسین، عون الحسن غازی طاہر ناصر علی، سرور حسین نقشبندی، اشفاق ناصر محمد افضال انجم، اعجاز رضوی	21 تا 32
4	منقبت	افروز رضوی، نسیم سحر، عون الحسن غازی	33 تا 35
5	رباعیات	سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	36 تا 37
6	قطعات	خاور اعجاز	38
7	ہائیکو	آفتاب خان	39 تا 40
8	ماہیے	رانا محمد شاہد	41

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	افسانے	بلقیس ریاض، فرخندہ شمیم، امیر حسین جعفری، حامد یزدانی عمار نعیمی، ملک نعمان حیدر حامی، بابر امین ابر، کنزیٰ خالق نور کمال شاہ، حمزہ حسن شیخ، عمران شاہد، اذان خالد	42 تا 94
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، انور شعور، خاور اعجاز راحت سرحدی، اقبال سرویہ، طالب انصاری، محمد انیس انصاری قیوم طاہر، گلزار بخاری، شریف ساجد، شاہنواز زیدی، رضا اللہ حمیر اکرم ناصر، طارق بٹ، شوکت محمود شوکت، معداللہ شاہ، غافر شہزاد تابش کمال، جمشید چشتی، صادق جمیل، عابد خان عابد، رخشندہ نوید خالدہ انور، نبیل احمد نبیل، ارشد محمود ارشد، فیض رسول فیضان شبیر نازش، طاہر حنیف، محمد سلیم ساگر، تنویر قاضی، اصغر علی بلوچ علی حسین عابدی، سرور فرحان، احمد نواز، احمد جلیل، محمد افضال انجم اعجاز روشن، ہمایوں پرویز شاہد، سید فرخ رضا ترمذی، انوار انجم قیصر مسعود، میتھیو محسن، محمد دلشاد رانا، حسنین سحر، مسعود احمد، قمر نیاز طاہر ناصری، محمد نوید مرزا، اکرم جاذب، افضل ہزاروی، سمیع اللہ عرفی الماس شمی، شاہ روم خان ولی، ظہور چوہان، جیا قریشی، نائلہ راٹھور محمد اشفاق بیگ، کوکی گل، راجہ عبدالقیوم، اسد رضا سحر، شمع ملک سید ظہیر کاظمی، نوید عاجز، ندیم ملک	95 تا 160
11	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، جمیل احمد عدیل، منظر حسین اختر، بیا جی دردانہ نوشین خان، تصور اقبال، ارشد محمود ارشد، عامر عباس ناصر اعوان افتخار الحق، اظہار الحسن بخاری، اظفر رضا، تنویر قاضی آفتاب احمد ملک، نعمان منظور	161 تا 218
12	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، نسیم سحر تنویر قاضی، اوصاف شیخ، فیاض تحسین، مسعود احمد، ارشد محمود ارشد امجد بابر، سید فرخ رضا ترمذی، نائلہ راٹھور، راجہ رحمان، خالق آرزو عائشہ احمد جاوید، محمد عبداللہ، نسیم خان	219 تا 241

حمد

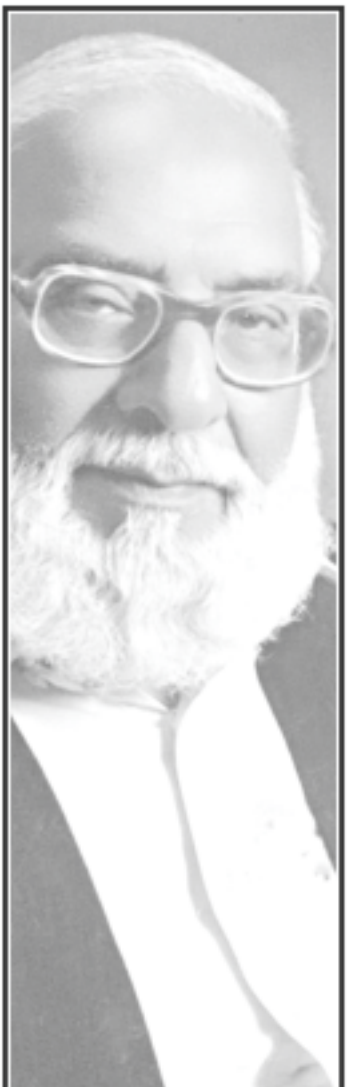

ازل سے بھی پہلے ابد کی صدا
خدا ہی خدا ہے ، خدا ہی خدا

وہی دل کہ جس میں وہ گھر کر گیا
وہی گھر ، وہی دل ہوا پارسا

کوئی حد امکاں میں ہے یا نہیں
نہیں حکم کن سے کوئی ماورا

اعانت طلب سے اسے پیار ہے
اک اشک ندامت ہوا کیمیا

کوئی اس کی نیکی کا ہم سر نہیں
جو اس کے لیے ہر بدی سے لڑا

جہانوں کی رحمت مقدر بنی
جو کعبے کی آغوش میں آ گیا

رسالت ہے توثیق توحید کی
ریاض رسالت ہے جوبن بھرا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

دن دکھاتا ہے، شب دکھاتا ہے
چار سُو اپنی چھب دکھاتا ہے

دیکھ سکتے ہیں ہم فقط اُتنا
جس قدر ہم کو رب دکھاتا ہے

جانتا ہے ہماری تاب نظر
پورا جلوہ وہ کب دکھاتا ہے

آنکھ کے اختیار میں نہیں کچھ
جب وہ چاہے ہے، تب دکھاتا ہے!

جتنے منظر ہیں سامنے ، اُن میں
اپنی ہی تاب و تب دکھاتا ہے

جتنے بھٹکے ہوئے ہیں لوگ، اُن کے
قلب کو منقلب دکھاتا ہے

ڈھالتا ہے وہ ماہ و سال میں بھی
جو ہمیں روز و شب دکھاتا ہے

چاہتا ہے ہم اس پہ غور کریں
کچھ کہاں بے سبب دکھاتا ہے

وقت سے آشنائی دینے کو
دن گزرتے ہی شب دکھاتا ہے

دیکھتا رہتا ہوں نسیمِ سحر
جو مجھے میرا رب دکھاتا ہے

نسیمِ سحر

حمدیہ

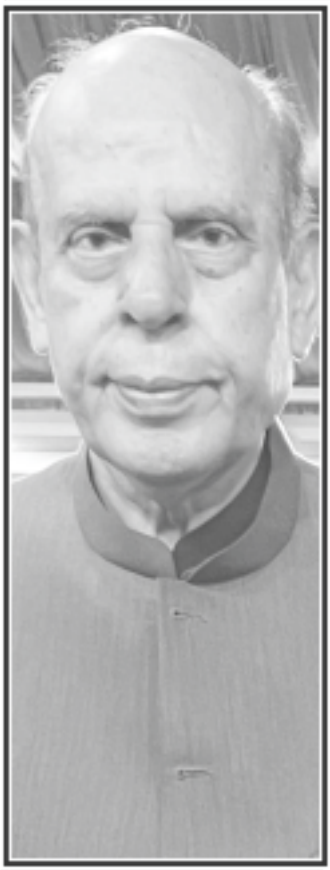

مرے قلم میں کہاں طاقت بیاں ساجد
احاطہ کر سکے خالق کی کارسازی کا
زبان چُپ ہے، گُماں دنگ، اور نظر حیراں
تمام عُمر گنوادی گُناہ گاری میں
دل وزباں کے تفاوت میں،
آہ وزاری میں

لیا جو نام بھی اس کا
تو حرف مطلب سے
بجُز دعائے طلب اور کُچھ نہیں سوچا
جلیل ہے مرا مالک تو ہے رحیم بھی وہ
بہ پاس حُرمت آدم، مرا نگہباں ہے!

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ارحم راحم ، رحمت کا چھینٹا
تو ہی مالک ہے ، سیدھے رستوں کا

حمد

جب وہ قسمت میں مری کوئی سفر رکھتا ہے
خود ہی پھر چلنے کو اک راہ گزر رکھتا ہے

جانچتا رہتا ہے وہ حسن عمل کو سب کے
اور نگاہوں میں سبھی عیب و ہنر رکھتا ہے

اس نے دے رکھی ہے شب عیب چھپانے کے لیے
کام دھندوں کے لیے دن کا گزر رکھا ہے

زندگی میں وہ اندھیرے نہیں رہنے دیتا
سر پہ روشن وہ مرے شمس و قمر رکھتا ہے

اس نے ترتیب عبادت کی بنا رکھی ہے
اس کے آگے اسے جھکنا ہے جو سر رکھتا ہے

کب یہ ممکن ہے کہ اوجھل ہو کوئی شے اس سے
اک وہی ہے کہ جو ہر ایک خبر رکھتا ہے

کر کے پیدا وہ یونہی چھوڑنے والا ہی نہیں
وہ ضرورت کی ہر اک شے پہ نظر رکھتا ہے

بند ہو جائیں اگر چاروں طرف بھی راہیں
وہ کھلا بندوں پہ اک آپ ہی در رکھتا ہے

پھول اور غنچے امیدوں کے کھلے رہتے ہیں
آس کا دل میں ہرا ایسے شجر رکھتا ہے

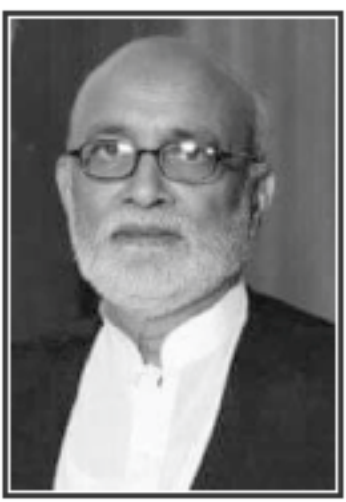

محمد افضال انجم

نعتؐ

اُنؐ کے اقوال و کردار کی دھوم ہے
ہر طرف میرے سرکارؐ کی دھوم ہے

جو چٹائی پہ سجتا تھا اِس شان سے
میرے آقاؐ کے دربار کی دھوم ہے

ان کے نعلین سر پر ہوں رکھے ہوئے
کس قدر میری دستار کی دھوم ہے !

آ گیا ہے بُلاوا جو سرکار سے
شہر میں اِس خطاکار کی دھوم ہے

شہرِ طیبہ سے منسوب جو بھی ہوا
پھول کی دھوم ہے، خار کی دھوم ہے

روشنی روشنی وہ در و بام ہیں
شہرِ طیبہ کے انوار کی دھوم ہے

آپؐ نے اپنے ہاتھوں لگائے تھے جو
ان کھجوروں کے اشجار کی دھوم ہے

نعت آقاؐ نے مجھ سے جو لکھوائی ہے
اس کے رخشندہ اشعار کی دھوم ہے

فلسفے دوسرے سب تو بیکار ہیں
بس محمدؐ کے افکار کی دھوم ہے

بہرِ درماں جو سُوئے مدینہ چلا
اِک سمجھدار بیمار کی دھوم ہے

منعکس میری آنکھوں میں ہے جو نسیمؔ
میرے اِس شوقِ دیدار کی دھوم ہے

نسیمِ سحر

نعتؐ

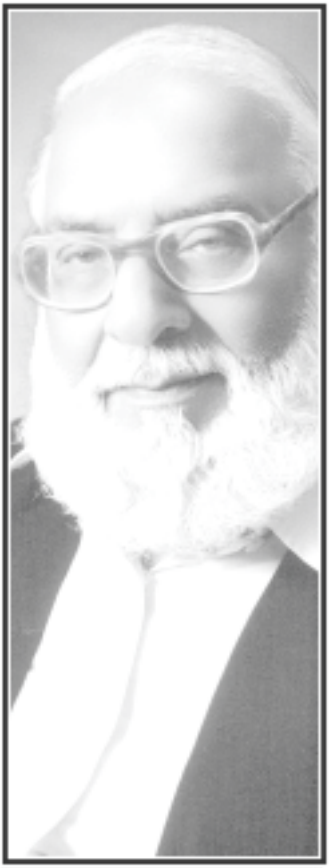

حب نبیؐ میں ڈوب کے جو راہ پائے گا
مقبول بارگاہ خدا ہوتا جائے گا

احکام مصطفیؐ کی جو حرمت کو جان لے
ہرگز برائیوں سے وہ دھوکہ نہ کھائے گا

انعام اس کو سارے جہاں کے نصیب ہیں
جو اپنے دل میں یادِ نبیؐ کو بسائے گا

جس کو ہوئی نصیب اطاعت حضورؐ کی
ساحل پہ بامراد سفینہ وہ لائے گا

کیا کیا درود پاک کے پڑھنے سے سوز و درد
قلب و جگر میں قول و عمل میں سمائے گا

میرا ریاض نعت بہت پربہار ہے
حسن عمل ہی میرا مقدر بنائے گا

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ محبوب رب رحیم ، وہ آپؐ رسول کریمؐ
وہ محبوب رب علم و حلم و علم دیار

نعتؐ

منظرِ طیبہ جو افکار میں آ جاتے ہیں
نور نقطے مری پرکار میں آ جاتے ہیں

سبز گنبد سے منور ہو تصور جن کا
وہ قمر مطلع انوار میں آ جاتے ہیں

نکہت و نور بنے ان کا حوالہ اے دل!
جو مدینے کے سمن زار میں آ جاتے ہیں

ذکرِ سرکارؐ کی دولت جنھیں مل جاتی ہے
لطف و اکرام کی چھتنار میں آ جاتے ہیں

ایک ہی آن میں بھر جاتے ہیں کاسے اُن کے
جب فقیر آپؐ کے دربار میں آ جاتے ہیں

جن کو دنیا ہی میں جنت کی طلب ہوتی ہے
قربتِ احمدِؐ مختار میں آ جاتے ہیں

باوضو رہتے ہیں اذکار و خیالات ان کے
جو بھی مدحت کے سخن زار میں آ جاتے ہیں

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

سب انبیاؑ ہیں پنکھڑیاں ، آپؐ پھول ہیں
ہم تو حضور آپؐ کے قدموں کی دھول ہیں

دنیا کو بندگی کا قرینہ سِکھا دیا
آفاق تک پہنچنے کا رستہ دِکھا دیا

آئین وہ دیا ہے کہ قرآں کہیں جسے
تشکیل دی وہ قوم ، مسلماں کہیں جسے

پہلے نہ تھا یہ ربط مگر اَب اُنہیؐ سے ہے
مجھ میں جو روشنی ہُوئی وہ سب اُنہیؐ سے ہے

گزریں گے ہر مقام سے مہتاب تھام کے
جلتے ہیں جن کے دل میں چراغ اُنؐ کے نام کے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نعتؐ

وہ بھی دن آئے کہ جب میرا مقدر چمکے
خاک طیبہ کی ہو اور میری جبیں پر چمکے

مطلعِ نعت پہ ان شعروں کی تابانی سے
ظلمت دہر میں مجھ جیسا بھی احقر چمکے

طے مدینے کا سفر میں کروں بند آنکھوں سے
اور جب آنکھ کھلے گنبد اخضر چمکے

صاف اس طرح سے ہوں ظاہر و باطن میرے
آپؐ کا خلق مری روح کے اندر چمکے

آپؐ کی بات سر جلسہ انوار محیط
آپ کی ذات سر پردۂ محشر چمکے

میرے ہونٹوں پہ کھلیں مدحت سرکارؐ کے پھول
میری پلکوں پہ سدا ذکر پیمبرؐ چمکے

آپؐ کی سوچ سے نکھرے ہیں دو عالم گویا
آپؐ کی فکر سے سب دنیا کے منظر چمکے

روشنی دل میں نہ کیوں اترے انوکھی انجم
آپؐ کے ذکر کا جب مہر منور چمکے

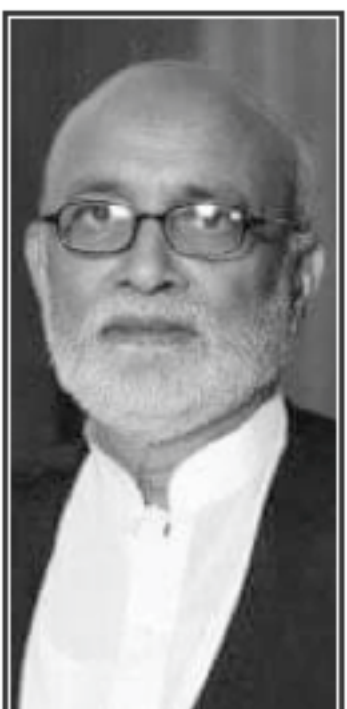

محمد افضال انجم

نعتؐ

کچھ اتنا بھا گیا ان کو مدینہ کا منظر
کہ آنکھیں پھر سے بضد ہیں وہی دکھا منظر

زمین و آسماں کا فرق اب سمجھ آیا
کجا وہ خواب مدینہ کے اور کجا منظر

سجا کے لایا ہوں آنکھوں میں گنبد خضری
مجھے دکھائے گا پھر سے وہی خدا منظر

مدینہ سوچوں مدینہ دکھائی دینے لگے
ہے میری آنکھ کی پتلی میں جاگتا منظر

ہے حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں موجود
جدا جدا ہیں سب آنکھیں جدا جدا منظر

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ہر نعمت کا مالک ، وہ نعمتوں کے قاسم
مجھ کو مرے ہادیؐ ٹھہرا دیں ، رحمت کا حقدار

نعتؐ

ہے مدینہ میں یہی خیرُ العمل چل سر کے بل
سب مقدر کے نکل جائیں گے بل چل سر کے بل

ہوں لبوں پر نغمہ ہائے الصلوٰۃ والسلام
لے کے آنکھوں میں عقیدت کے کنول چل سر کے بل

عین ممکن ہے تری ہو تاج پوشی حشر میں
معجزہ یہ ہو بھی سکتا ہے اٹل چل سر کے بل

آنکھ نیچی، کپکپاتے ہونٹ، دل دھڑکن بدر
سانس بھی تو لے اگر، ہو بے خلل چل سر کے بل

ساتھ تیرے ہیں ملائک بھی یہاں ستّر ہزار
بارگاہِ مصطفیٰ میں سر کے بل چل سر کے بل

ایک لمحے کی بھی سُستی کے نتیجے میں میاں
ہو بھی سکتے ہیں تلف سارے عمل چل سر کے بل

اُس عمل کی ہے تلافی کا یہی موقع جمیل
کھایا تھا آدم نے جنت میں جو پھل چل سر کے بل

صادق جمیل

نعتؐ

بتا کیا کیا اے میری چشمِ تر دیکھا مدینے میں
بہاریں ہی بہاریں تھیں جدھر دیکھا مدینے میں

سنہری جالیاں، گنبد، فضائیں نور برساتی
خدا کا لطف تاحدِ نظر دیکھا مدینے میں

پزیرائی بہت دیکھی وہاں درد و محبت کی
فقیرِ بے نوا کو معتبر دیکھا مدینے میں

وہ بابِ مسجدِ نبوی، کھڑے ہیں منتظر سارے
ہجومِ عاشقاں وقتِ سحر دیکھا مدینے میں

درِ محبوب کے جلووں میں ہیں گم سارے شیدائی
کسی کو بھی نہیں اپنی خبر، دیکھا مدینے میں

تمنا تھی رضا پوری ہوئی اب اور کیا چاہوں
کہ عکسِ جلوۂ خیرالبشر دیکھا مدینے میں

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری، چاہت کی مہکار

نعتؐ

کرم کی انتہا سے رابطہ ہے
در خیر الورا سے رابطہ ہے

چٹائی پر وہ ہیں تشریف فرما
مگر ارض و سما سے رابطہ ہے

کرے جو واسطہ شامل نبی کا
اسی کا بس خدا سے رابطہ ہے

گلوں کا خوشبوؤں کا تازگی کا
مدینے کی ہوا سے رابطہ ہے

جو آل پاک سے رکھیں محبت
انھی کا مصطفٰے سے رابطہ ہے

چلی آئے گی خود قدموں میں منزل
گر ان کے نقش پا سے رابطہ ہے

میرا پیغام لے جاتی ہے اکثر
مرا باد صبا سے رابطہ ہے

میری مشکل کشائی کیوں نہ ہوتی
مرا مشکل کشا سے رابطہ ہے

جہاں سرور دوا ہے ہر مرض کی
اسی دارالشفا سے رابطہ ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

نعت کی رہ پہ اَن کہی کا سفر
حرف و معنی ہیں عاجزی کا سفر

جس قدر بھی ہے روشنی کا سفر
ہے پیمبر کی پیروی کا سفر

اُن کے رستے پہ چل کے آساں ہے
حق شناسی و خود گری کا سفر

حق رسا کر دیا محمدؐ نے
تھا سفر ورنہ گمرہی کا سفر

جاں تھی غم کے شتر پہ دشت بہ دشت
دل کہاں کرتا پھر؟ خوشی کا سفر

گر نہ دیتے حضورؐ اسے مہمیز
رُک گیا ہوتا زندگی کا سفر

ہوتا اب طے ہے سارا اشکوں سے
نارسائی و بے بسی کا سفر

کیوں بھٹک جائے وہ؟ ہے جس کی طلب
اُن کی سنت سے اِھدنی کا سفر

آتا آخر درِ حضورؐ پہ ہے
جو بھی ہو علم و آگہی کا سفر

زادِ تقویٰ بہ قندِ صل علیٰ
ہونے دے گا نہ کوئی پھیکا سفر

کیا ہے اسریٰ بعبدی لیلاً
سب پہ صرف ان کی برتری کا سفر

تو بھی احرام عشق باندھ، آصف!
نعت سے کر کوئے نبیؐ کا سفر

مرزا آصف رسول

سلام

جہانِ فکر و نظر سب مرا حسینی ہے
مری حیات کا ہر ضابطہ حسینی ہے

حسینیت ہی رہے گی ہمیشہ دنیا میں
کہ حق شناس کا ہر زاویہ حسینی ہے

ہزار راہ میں کانٹے بچھائیں میرے، مگر
وہ جان لیں کہ مرا سلسلہ حسینی ہے

یزیدیت کو بقا مل نہیں سکے گی کبھی
کہ مومنوں کا ہر اک معرکہ حسینی ہے

چلے ہیں جو بھی مرا صبر آزمانے کو
خبر ہو ان کو مرا آسرا حسینی ہے

ضرور آج یہ کربلا سے ہو کے آئی ہے
مرے خیال میں بادِ صبا حسینی ہے

پیام حق ہے یہ افروز اس جہاں کے لیے
جہاں میں حق کا فقط راستہ حسینی ہے

افروز رضوی

سلام

شبِ عاشورہ میں جب جل اٹھے اشکوں کے چراغ
دور تک روشنی بکھراتے تھے زخموں کے چراغ

شام سے پہلے تو روشن تھے لہو کی لو سے
شام ہوتے ہی سبھی بجھ گئے رستوں کے چراغ

شام کا لمبا سفر سامنے ہے زینب کے
آندھیوں میں بھی فروزاں تھے شہیدوں کے چراغ

دیکھ سکتے ہو تو پھر حوصلہ کر کے دیکھو
کیا دکھائیں تمہیں جلتے ہوئے خیموں کے چراغ

خون میں بھیگے ہوئے ریگ کے ذروں میں جلیل
جگمگاتے ہی رہے آئینہ خانوں کے چراغ

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد شکست و فتح کے معنی بدل گئے
بازار شام ہے کہ شب التباس ہے

سلام

حسینؓ ابنِ علیؓ ، لاالٰہ کی بنیاد
اُسی کے دم سے شہادت کی کائنات آباد

حسینؓ ، عظمتِ اسلام کا نقیب و امیں
حسینؓ اوجِ فلک ، انکسارِ فرشِ زمیں

حسینؓ ، حق و صداقت کا ہے نمایندہ
اُسی کی شانِ عزیمت سے دین پایندہ

حسینؓ ، تختِ حکومت کو کیا سمجھتا ہے
وہ تاجِ شاہی کو بھی خاکِ پا سمجھتا ہے

حسینؓ ، روشنیوں کا سفیر ٹھہرا ہے
علیؓ کے لال کا رنگِ ثبات گہرا ہے

حسینؓ ، سبطِ نبیؐ ، جانِ پنجتنؑ بھی ہے
وہ خانوادۂ زہرہؑ کا بانکپن بھی ہے

حسینؓ ، اہلِ عقیدت کی آنکھ کا تارا
وہ دُودمانِ مودّت کو جان سے پیارا

حسینؓ ، مظہر و مصداقِ حکمِ ''فی القربیٰ''
پیامِ آیۂ تطہیر اُس کے گھر اُترا

حسینؓ ، خوبی و عظمت ہزار رکھتا ہے
یزید کیا شرف و افتخار رکھتا ہے ؟

حسینؓ ، نامِ خدا ، سارا کچھ ہی وار گیا
حسینؓ جیت گیا اور یزید ہار گیا

حسینیتؓ ہے اساسِ فروغِ انسانی
یزیدیت تو ہے فیضانؔ بس پشیمانی

فیض رسول فیضان

سلام

مسعود احمد

نبی کے پیارے نواسوں کا ذکر کرتے ہیں
اے کربلا تیرے پیاسوں کا ذکر کرتے ہیں

وہ جن کے پیرہن افلاک سے اترتے تھے
ہم ان دریدہ لباسوں کا ذکر کرتے ہیں

خلاصہ یہ ہے حسین آپ جیسا کوئی نہیں
مورخین پچاسوں کا ذکر کرتے ہیں

چراغ گل تھے مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا
ہم ان سراپا سپاسوں کا ذکر کرتے ہیں

نویں کی رات ہے میں اور نینوا کی زمین
اداس ہو کے اداسوں کا ذکر کرتے ہیں

وہی جو نوکِ سناں پر بھی برقرار رہے
حسین تیرے حواسوں کا ذکر کرتے ہیں

حسین کوفہ و بغداد چیخ چیخ کے پھر
یزید موقع شناسوں کا ذکر کرتے ہیں

سلام

کوئی تنہا لڑ رہا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں
کیا نئی اک کربلا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

کٹ چلا ہے سر حبیب ابنِ مظاہرؓ کی طرح
جان آقاؑ پر فدا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

مسکرا کر تیر کھائے ایک پیاسا شیر خوار
اس پہ بھی شکرِ خدا ہے چلچلاتی دھوپ میں

دونوں بازو کٹ گئے پر آج بھی غازی تیرا
ہر علم لہرا رہا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

ناناؐ کے بوسوں سے مہکی گردنِ شبیرؑ ہے
کند سا خنجر چلا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

دہکے انگاروں کی صورت اب ہے ریگِ نینوا
آگ ہر خیمہ بنا ہے، چلچلاتی دھوپ میں

تا قیامت مومنو اب کربلا سے شام تک
گلشنِ زہراؑ کھلا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

پگھلی جاتی ہے بدن کی برف تیزی سے عقیل
یہ فنا کا راستہ ہے ، چلچلاتی دھوپ میں

عقیل رحمانی

سلام

مرے نبی کے نواسے ، مرے امام حسین
خدا کا شکر کہ ہم ہیں ترے غلام حسین

بچا لیا ترے سجدے نے سب کی محنت کو
سو ہر نبی نے کیا تیرا احترام حسین

اے کاش اہل جہاں کی سمجھ میں آ جاتا
ترا خدا سے تعلق ، ترا مقام ، حسین

جہاں جہاں بھی جہاں میں ہے ظلم سے نفرت
ترے کٹے ہوئے سر کا ہے فیض عام حسین

جفا کی آہنی زنجیر توڑ کر تو نے
بنا کے ، چھوڑ دیے ، حر ، کئی غلام ، حسین

بنایا تو نے جو کرب و بلا کو پایہ ء تخت
لرز اٹھا تری ہیبت سے تخت شام حسین

نہیں ہے گریہ و ماتم ہی بس ترے غم میں
ترے عدو پہ ہے لعنت بھی صبح و شام حسین

ترے قبیل کے قیدی بھی سرخ رو ٹھہرے
گلی گلی میں سنا کر ترا پیام حسین

سنا رہا تھا تو قرآن نوک نیزہ سے
اے میرے صبر کے پیکر، اے خوش خرام حسین

تجھے ہی زیبا ہے دستار مصطفائی کی
تھا دین حق کو بچانا ترا ہی کام حسین

ہیں تیری پیاس پہ راوی، چناب، سندھ نثار
اے سل سبیل کے مالک، اے تشنہ کام حسین

سلام بھیج رہا ہوں بڑی عقیدت سے
کہ میری سمت بھی آئے ترا سلام حسین

جو تیرے غم میں ہے رویا وہ پھر نہیں رویا
کہ سب غموں کا مداوا ہے تیرا نام حسین

دعائے فاطمہ زہرا کا مستحق ٹھہرے
کرے جو آپ پہ گریے کا اہتمام حسین

علمدار حسین

سلام

ہے ستم کا جہاں اور ابنِ پیمبر تنہا
دشتِ پرہُول میں ہے وارثِ منبر تنہا

خاک پر بکھرے ہوئے کتنے ہی گل پیکر ہیں
رہ گیا مقتلِ خوں میں شہِ صفدر تنہا

جس کی ہیبت سے لرزتے تھے جری دنیا کے
رن میں ہے فاطمہؑ کا لعلِ مطہر، تنہا

لاشۂ نور اٹھائے ہوئے سجدے میں گرا
عرش تک گونج اٹھا نالۂ اصغرؑ تنہا

پیاس کے دشت میں آیا وہ امامِ عطشاں
وقت کی نبض تھمی، خشک ہے ساغر تنہا

خون میں ڈوبا ہوا آ گیا پیاسا اکبرؑ
باپ کو کر گیا ہم شکلِ پیمبر، تنہا

ذرے ذرے میں بکھر کر بھی وہ یکتا ہی رہا
مثلِ خورشید ہے وہ مہرِ منور تنہا

لکھے غازیؔ جو کوئی حرفِ ثنائے مولاؑ
حشر تک ہو گا نہ پھر صاحبِ دفتر تنہا

عون الحسن غازی

سلام

پیدا عزا کے ماہ نے حزن و ملال کر دیا
وقفِ غمِ حسینؑ پھر میرا یہ سال کر دیا

کوئی درِ حسینؑ سے خالی کبھی گیا نہیں
سب کو سخی کے لعل نے صاحبِ مال کر دیا

اُن کی کوئی مثال ہے اور نہ کوئی نظیر ہے
زہرا نے اپنی گود میں جنکو بھی پال کر دیا

بغضِ علیؑ کی عمر بھر چارہ گری نہ ہو سکی
بغضِ علیؑ نے باغی کا جینا محال کر دیا

اصغرؑ کو تیر مار کر تجھ کو شکست ہو گئی
اپنا خراب خرملہ ظلم سے حال کر دیا

ڈنکا غمِ حسینؑ کا ایسا بجا جہان میں
دنیا کے ہر یزید کا بے کار حال کر دیا

مجھ سے یہ کہہ کے میری ماں دنیا سے کوچ کر گئی
رکھنا غمِ حسینؑ کا دیکھو سنبھال کر دیا

روشن کیے چراغ پھر ہم نے بھی اِس چراغ سے
تازہ غمِ حسینؑ سے ماضی و حال کر دیا

نعرہ حیدری لگا محفل میں جاں پڑ گئی
جو تھا غلام شیرِ حق اُس نے دھمال کر دیا

ساری سخنوری مری ان کی عطا ہے دہر میں
میں نے بھی شہؑ کے فیض سے خوب کمال کر دیا

آیا سوال کفر جب کوئی علیؑ کے سامنے
اپنے ہر اک جواب سے مہمل سوال کر دیا

تیغ ستم سے سر کٹا اِسکا تو کوئی غم نہیں
ہو کر شہید کفر کو شہؑ نے نڈھال کر دیا

طاہر ناصر علی

سلام

یہ ظلمتوں کا چاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے
فلک پہ اس کی دھاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

لب مہ و نجوم پر ہیں اب بھی اس کے تذکرے
شفق سی تابناک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

یہ کیا کیا حسین نے کہ اب بھی اس زمین پر
ستم گروں کی ناک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

ملی ہوئیں محبتوں کی سرحدیں ہوں جس طرح
عجب یہاں تپاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

اذیتوں کے قہر کا اور انتہائے صبر کا
یہاں پہ اشتراک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

صداقتوں کی اس جگہ رقم ہوئی ہے داستاں
یہ مصلحت سے پاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

شکست و فتح کے یہاں اصول ہی بدل گئے
یہ کربلا کی خاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

سرور حسین نقشبندی

سلام

کیا گیا ہے بڑے احترام سے آغاز
نظر جھکا کے درود و سلام سے آغاز

تو آفتاب سے پہلے کی روشنی کو سمجھ
جنابِ حُر نے کہا مجھ غلام سے آغاز

عَلَم لگائے گئے کوفہ سے مدینہ تک
کہ لوگ دیکھ سکیں اختتام سے آغاز

میں کیسے تجھ کو بتاؤں کہ کیا ہے یوم الدین
یہ ایسا دن ہے جو ہوتا ہے شام سے آغاز

یہ کائنات نہیں محفل مسالمہ ہے
کیا گیا ہے زمانہ سلام سے آغاز

بس اس لیے کہ ترے ساتھ سب کھڑے ہو جائیں
نمازیں کرنا پڑی تھیں قیام سے آغاز

اشفاق ناصر

ابھی یہ سمجھے نہیں انبیاء کرام کی شان
نجانے سمجھیں گے کیسے مرے امام کی شان

وہاں حسینؑ کی بیٹی دیا جلاتی تھی
بیان کیسے کروں کربلا کی شام کی شان

یہ یاد رکھنا کہ ردِّ بلا ہے ذکرِ علیؑ
بتاؤں گا کبھی تفصیل سے میں نام کی شان

فلک جھکا تھا وہاں گرتے لاشے دیکھنے کو
وہی بتائے گا کیسی تھی انہدام کی شان

میں گریہ کرتا حسینی پکارا جانے لگا
کسی نے دیکھی ہے ایسی کسی بھی کام کی شان

عجیب نہج بلاغت پہ ہے کلامِ علیؑ
ہر ایک لفظ میں پوشیدہ ہے کلام کی شان

یہ میرے شعر نہیں آنسوؤں کے چھینٹے ہیں
سخن وروں میں جدا ہے مرے سلام کی شان

سلام

جو کربلا میں لٹا ہے وہ گھر حسینؓ کا ہے
جو سربلند رہے گا وہ سر حسینؓ کا ہے

جو اپنی گود کے پالے تھے کر دیئے قربان
عجیب قلب نرالا جگر حسین کا ہے

شباب مقصد اعلیٰ پہ جس نے وار دیا
جوان اکبرؓ رعنا پسر حسینؓ کا ہے

بچا لیا ہمیں گمراہی اور ضلالت سے
تو زیرِ بار ہوا ہر بشر حسینؓ کا ہے

انوکھا ذکر ہے اس کا جو سب پہ حاوی ہے
ہر ایک ذکر پہ اتنا اثر حسینؓ کا ہے

دیئے جو عزم و عمل کے ہیں ہر طرف روشن
اجالا ان میں بھی ہر ہر نگر حسینؓ کا ہے

میں اس کے ادنیٰ غلاموں کا بھی غلام انجم
جڑا ہوا ہوں میں جس در سے در حسینؓ کا ہے

محمد افضال انجم

سلام

ہوا کے ہاتھ جلے، خیموں کو بجھاتے ہوئے
زمین روئی تھی یہ واقعہ سناتے ہوئے

سلامی لیتے ہوئے بڑھ گئے بہشت کی سمت
نشان سینے پہ ماتم کا ہم دکھاتے ہوئے

وہ ہاتھ کیسے کٹے ارض بینوا یہ بتا
بلک بلک کے میں رویا علم اٹھاتے ہوئے

غمِ حسین نے روشن کیا ہمیں ورنہ
جہاں میں ہوتے کہیں ہم بھی ٹمٹماتے ہوئے

مجھے پکارا ہے پھر سامرہ کی مٹی نے
میں کیسے جاؤں گلِ تعزیت بناتے ہوئے

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے سامنے حرم تھا، مجھے دیر ہو رہی تھی
سو، وجود بھی عدم تھا، مجھے دیر ہو رہی تھی

منقبت

دیارِ فقر کی تابندگی علی سے ہے
زمیں سے تا بہ فلک روشنی علی سے ہے

علی کے دم سے فروزاں ہے شہرِ صدق و صفا
رہِ حیات کا ہر اک ولی علی سے ہے

بہادری میں، سخاوت میں، علم و حکمت میں
ہر اک مقام کی بس دلکشی علی سے ہے

علی ہیں شہرِ خدا بابِ شہرِ علم بھی ہیں
کمالِ زیست کی ہر برتری علی سے ہے

علی ولی کی ولایت ہے فخرِ کون و مکاں
حیات افزاء ہر اک آگہی علی سے ہے

علی کے ذکر کی عظمت ہے اور ہیبت بھی
منافقوں کی کمر ٹوٹتی علی سے ہے

مرا عقیدہ ہے افروز بزمِ ہستی میں
شعورِ عظمتِ عشقِ نبی علی سے ہے

افروز رضوی

منقبت

دل بنا ہے کربلائے کربلا
ہر گھڑی آئے صدائے کربلا

دیکھ کر کرب و بلائے کربلا
لکھ دیا صبر و رضائے کربلا

ہم سے سب ماتم سراؤں کو بہت
راس آتی ہے ہوائے کربلا

مومنوں کے دل کا عالم دیکھیے
کربلا ہے، کربلائے کربلا !

میرا بس اتنا تعارف ہے میاں
میں فقط ہوں خاک پائے کربلا!

دم بہ دم تفسیرِ حق ایسے کرے
نقش باطل کے مٹائے کربلا

درسِ حق کے فلسفے کے روپ میں
چاروں جانب پھیل جائے کربلا

کُوفیوں کا بھی مقدّر ہو کبھی
کاش اُن کو بھی بُلائے کربلا

آمدِ ماہِ محرّم کے طفیل
سارا جگ، ماتم سرائے کربلا

آج بھی اُن حق پرستوں کا نسیمؔ
سوگ روز و شب منائے کربلا

نسیمِ سحر

منقبت

ہفتِ کشور، بتول کے گھر کا
ایک پتھر بتول کے گھر کا

خاکِ در، بن گئی ہے عرشِ بریں
ہے یہ منظر بتول کے گھر کا

میرے پانچوں حواس میں خوشبو
ذکرِ عنبر بتول کے گھر کا

آیۂ حق کا نور ہے جس میں
ایسا مظہر بتول کے گھر کا

بزمِ عالم سمیٹ لایا ہوں
ہو کے نوکر بتول کے گھر کا

ہے یہ خیرِ کثیر سب کے لیے
حوضِ کوثر بتول کے گھر کا

دل کو ملتی ہے روشنی غازی
نام لے کر بتول کے گھر کا

عون الحسن غازی

رباعیات

جادوئی فضاؤں کا اثر لگتا ہے
مجھ پر مرے گاؤں کا اثر لگتا ہے
زندہ ہوں، میں پردیس میں بھی زندہ ہوں
یہ تیری دعاؤں کا اثر لگتا ہے

.....

مخمور گھٹاؤں کا اثر لگتا ہے
کچھ تازہ ہواؤں کا اثر لگتا ہے
آنکھوں میں تقدس جو نظر آتا ہے
ماؤں کی رداؤں کا اثر لگتا ہے

.....

بے انت خلاؤں کا اثر لگتا ہے
تجھ پر بھی بلاؤں کا اثر لگتا ہے
مجھ سے جو خفا رہتے ہو ہر موسم میں
کچھ جھوٹے خداؤں کا اثر لگتا ہے

.....

اب عشق کی ترقیم خدا ہی جانے
الفاظ کی تفہیم خدا ہی جانے
پاگل ہوا میں تو، تری خاطر پاگل
یہ حسن کی اقلیم خدا ہی جانے

.....

بھرپور ادا دیکھ کے میں ہار گیا
کچھ اس کی انا دیکھ کے میں ہار گیا
میں ایک دیا جل رہا تھا کھڑکی میں
پھر تیز ہوا دیکھ کے میں ہار گیا

.....

بچپن مرا گزرا تھا قابیل کے ساتھ
ہر لمحہ میں رہتا تھا قابیل کے ساتھ
معلوم تھی بابا کو اگر ساری بات
پھر کیوں مجھے چھوڑا تھا قابیل کے ساتھ

.....

جانا ہے اگر، ٹھیک ہے اللہ حافظ
لمبا ہے سفر، ٹھیک ہے اللہ حافظ
رستے میں کئی آئیں گے آباد نگر
ویران نگر، ٹھیک ہے اللہ حافظ

.....

پر امن رہو، بات مکمل کر لو
تھوڑا سا رکو، بات مکمل کر لو
شاید کبھی موقع ملے، یا پھر نہ ملے
کچھ بھی نہ کہو، بات مکمل کر لو

سعید اشعر

رباعیات

خالی ز ادا دستِ گل و لالہ نیست
محرومِ سخا دستِ گل ولالہ نیست
تصویرِ چمن ز کربلا رنگین است
محتاجِ حنا دستِ گل ولالہ نیست

.....

سوئے چمن انوار سحر ریختہ ای
کز اوجِ فلک شمس و قمر ریختہ ای
اے ابن علی آمدہ ای صورت ابر
در خاک بسے لعل و گہر ریختہ ای

.....

ذرے تھے قمر ضیاء کشی ایسی تھی
ششدر تھا فلک شمس گری ایسی تھی
تھرا گیا آفتابِ محشر کا چراغ
نیزے کی انی پہ روشنی ایسی تھی

.....

پیمانہء کوثر کی تمنا ہے حسین
خود دیدہء لولاک میں دریا ہے حسین
قدموں میں ہے نوع بشر کی تقدیر
تصویرِ زندگی کا فردا ہے حسین

.....

قلزم اذنِ گہر فشانی مانگے
موجِ دریا تابِ روانی مانگے
مقتل میں رقصِ آرزو جاری ہے
موت اصغرِ بے شیر سے پانی مانگے

گلدستہء رنگ کو صدا کرتے چلو
لالے کا سخن گوشِ صبا کرتے چلو
مشکیزۂ اشک بھی رہے زیرِ علم
ہم دوشِ جنوں رقصِ وفا کرتے چلو

.....

اک چاند پہ سورج کی انا روتی ہے
جلتا ہے جگر خلقِ خدا روتی ہے
دوش وفردا ہیں غم کے پہرے میں اسیر
شبیر کے ماتم میں قضا روتی ہے

.....

غم روٹھ گیا رقص قضا کرتی ہے
امید نشاط آزما کرتی ہے
یہ زندگی جو موت سے لیتی ہے خراج
اصغر کا ابھی قرض ادا کرتی ہے

محمد نصیر زندہ

قطعات

خاور اعجاز

شام کی سرمئی فضاؤں میں
یوں تری یاد کی شفق پھیلی
جیسے خوشبو اُڑی ہو پھولوں سے
جیسے رنگوں کی نکلی ہو ریلی

آمد ہے کس غزال رمیدہ کی باغ میں
بادِ صبا بھی گذری ہے کچھ بے قرار سی
کرنیں بھی آ رہی ہیں ستاروں کے شہر سے
کلیوں کے طشت میں لیے شبنم کی آرسی

لوگ تو بات بھی کہہ جاتے ہیں
موج کے ساتھ ہی بہہ جاتے ہیں
اور اِک ہم ہیں کہ سارے دُکھ درد
اپنی ہی جان پہ سہہ جاتے ہیں

کہیے تو کس سے کہیے روش جو کہ آج ہے
بے اعتبار لوگ ہیں بے حس سماج ہے
روشن تھیں جن دلوں میں محبت کی مشعلیں
اَب دیکھیے تو اُن پہ اندھیروں کا راج ہے

ہائیکو

عین دل میں شگاف کرتی ہے
تب سنورتی ہے زندگی اپنی
وہ نظر جب معاف کرتی ہے

دیکھ کر مجھ کو سیخ پا ہو گا
یہ بھی سوچا کہاں ہے ظالم نے
رُوٹھ جاؤں اگر تو کیا ہو گا

جاودانی ہے عشق اپنا بھی
دِل چرا کر کہاں وہ جائے گا
روز دیکھے گا یہ تڑپنا بھی

حسن کا اِک بہاؤ دیکھا تھا
ہم نے ہوش و حواس کھوئے تھے
جب لبوں کا کٹاؤ دیکھا تھا

میں تو گلزار میں چلا آیا
راز کھولا یہ اُس کی فطرت نے
وہ کسی غار میں چلا آیا

روشنی اُس نگاہ سے پُھوٹی
عشق نے آگ جو لگائی ہے
وہ مری سرد آہ سے پُھوٹی

سبز کونپل ہے ، سرخ غنچے ہیں
قفل اُس کے لبوں کا کُھل جائے
ہم بہت دور سے جو پہنچے ہیں

دید کی بارگاہ میں آیا
دل کی بے تابیاں بڑھیں اتنی
وہ مری خانقاہ میں آیا

تازہ تازہ کپاس پہنے گی
ایک جھومر سجے گا ماتھے پر
وہ بنفشی لباس پہنے گی

پُھول سارے ہی چومتا جاؤں
لا بدن کی اِدھر تراش خراش
یہ نشہ پی کے جُھومتا جاؤں

اپنی ہستی قتیل دیکھی ہے
ہوش مندی بحال کیسے ہو
اُس کی آنکھوں کی جھیل دیکھی ہے

چل گیا دِل پہ اُس کا تیرِ نظر
اب ہو اُمید کیا رہائی کی
مَیں ہوا اُس کا بس اسیرِ نظر

چن چکے لوگ سب کنول کے پھول
اُس کے بالوں میں ٹانکنے کے لیے
توڑ لایا ہوں پھر غزل کے پھول

سرخ باغات پر دھرے جب پاؤں
اُس کے گالوں پہ کچھ پسینہ تھا
تب تعاقب میں آ گئی تھی چھاؤں

وہ مجھے جب غزل سُناتا ہے
دیر تلک تتلیاں مہکتی ہیں
رنگ پھولوں کا اُڑ سا جاتا ہے

کچھ نئے زاویے مشین پہ رکھ
اپنی ہستی خلا میں پھینک مگر
پاؤں اپنے اِسی زمین پہ رکھ

آفتاب خان

ماہیے

دل میں وہ بستا تھا
آنکھوں سے بہے آنسو
شاید یہی رستہ تھا

وہ مجھ کو ہنساتی تھی
اور ہجر کی راتوں میں
وہ آگ لگاتی تھی

یادیں تو بھاری ہیں
تو اچھا لگے ہم کو
پھر خوشیاں ساری ہیں

شامیں تڑپاتی ہیں
ہر روز مجھے تیری
یادیں پھر آتی ہیں

رانا محمد شاہد

بھروسہ

شہر کے ایک محلے میں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ گھر کی دیواروں پر وقت کی تھکن صاف نظر آتی تھی۔ ان کے اندر کے رہنے والے لوگوں کی خود داری آج بھی نظر آتی تھی۔ اس گھر میں سلیم اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک سفید پوش خوددار شخص تھا۔ اس کا لباس نہ ہی اچھا ہوتا اور نہ ہی گھر میں کوئی آسائش کی چیز نظر آتی تھی مگر وہ اپنی خودداری پر ناز کرتا تھا۔

محلے کے لوگ زیادہ تر گداگر تھے....آسانی سے زندگی گزارنا چاہتے تھے....محنت اور کام سے کوئی لگاؤ نہیں تھا. صبح کے وقت ہاتھ میں تھیلیاں لے کر گلیوں اور بازاروں میں نکل جاتے۔ کوئی مسجد کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا...آتے جاتے لوگوں کو اللہ کا واسطہ دے کر پیسے بٹورتا اور کچھ لوگ ریسٹورنٹ کے باہر وہی اللہ اور رسول کا واسطہ دے کر شام تک خوب روپے اکٹھے کر لیتے....اور وہی لوگ محلے کے خوشحال لوگ تھے....اچھے اچھے پکوان پکتے اور چار سو کھانوں کی خوشبوئیں پھیل جاتیں....حامد سلیم کا بیٹا گھر کی کھڑکی کو کھول کر خوشبوئیں سونگھتا اور ماں سے کہتا...اماں یہ سب لوگ اچھے اچھے کھانے کھاتے ہیں اور ہم کیوں نہیں۔ فاطمہ خاموش ہو جاتی اور کہتی....ان شاء اللہ ہمارا اللہ ہمیں بھی کھلائے گا....بیٹی رابعہ بھی بہل جاتی اور شام کے وقت سلیم خالی ہاتھ جب لوٹتا تو فاطمہ کہتی۔

''کوئی کام ملا ہے کہ نہیں....وہ بچوں کی طرف دیکھ کر کہتا...ضرور ملے گا اللہ کا وعدہ ہے کہ ہر ایک کو روزی میں دوں گا....مجھے اللہ پر بھروسہ ہے''۔

سلیم فاطمہ نے درد بھرے لہجے سے کہا۔

سارا محلّہ کتنا خوشحال ہے....بچے اچھے کھانوں کے لیے ترستے رہتے ہیں۔

مجھے بھرپور اللہ پر بھروسہ ہے۔ نوکری ضرور ملے گی ہمارے بچے حق حلال کا لقمہ تناول کریں گے۔

بلقیس ریاض

فاطمہ خاموش ہو جاتی۔
وہ روز صبح سویرے کام کی تلاش میں نکل جاتا...ایک روز ایک شام سرد ہوا گلی میں اداسی بکھیر رہی تھی۔ سلیم تھکا ٹوٹا گھر واپس آیا آج بھی ہاتھ خالی تھے۔
بیوی صابر شاکر تھی آہستگی سے بولی۔
آج بھی کوئی نہیں ملا۔
''نہیں''
وہ بولی بچے بھوکے ہیں۔ گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ اس نے ایک ایک روٹی بچوں کو دی اور خود پانی پی کر لیٹ گیا۔
رات کی خاموشی میں اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔
دوسری شام گلی میں خوب پکوان پک رہے تھے...تو فاطمہ نے کہا سلیم میں سوچتی ہوں کسی سے مدد مانگے بجائے بھیک کے۔
وہ بولا۔
مدد اور بھیک میں کیا فرق ہے فاطمہ.....
ہاتھ پھیلانے والی بات ہے....میں نہیں مانگوں گا۔ رزق دینے والا اللہ ہے انسان نہیں۔ ہم پر آزمائش ہے۔ اس آزمائش پر ہمیں اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔
مجھے اپنے پیارے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ اس آزمائش پر ہمارا اللہ ہی ہمیں نکالے گا۔ ہمارے گھر میں بھی اچھے اچھے پکوان پکیں گے۔
اگلی صبح وہ ہمیشہ کی طرح گھر سے نکل پڑا آسمان پر ہلکی سی دھند تھی اور ہوا میں سردی تھی۔ وہ شہر کے ایسے علاقے کی طرف چلا گیا جہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔
وہاں ایک مالک مکان مزدور ڈھونڈ رہا تھا۔ سلیم نے اسے کہا مجھے کام چاہیے جو بھی ہوا کر لوں گا۔
اس نے غور سے سلیم کی اداس آنکھوں کی طرف دیکھا۔
اینٹیں اٹھا لو گے؟
''جی....جو کام کہیں گے کر لوں گا''۔
سلیم پورے دن محنت کرتا رہا....اینٹیں اٹھاتا رہا اس کے دل میں ایک سکون تھا....مالک نے شام کو اس کی محنت کی مزدوری دی اور کہا۔
کل سے مستقل کام پر آجانا....پیسے بڑھا بھی دوں گا۔ سلیم کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ کا شکریہ ادا کیا...اور جب گھر پہنچا تو آٹا...اور دالیں بھی لے گیا۔
فاطمہ سب چیزیں دیکھ کر خوشی سے کہنے لگی۔ بہت دعائیں مانگتی تھیں....کیا کام مل گیا—؟
اللہ پر بھروسہ جو کرتا ہے.....اللہ اس کی ضرور سنتا ہے.....فاطمہ نے جلدی جلدی کھانا پکایا اور بچوں نے بھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا...رات گہری ہو گئی تھی۔ آسمان پر چاند بادلوں کے پیچھے چھپ چھپ کر جھانکتے ہوئے مسکرا رہا

تھا...اور سلیم پرسکون نیند میں سو رہا تھا۔ ایسے گھر میں جو سفید پوش شخص کا گھر تھا۔ جس نے مشکل میں بھی اپنی عزت نیلام نہیں ہونے دی اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا اور آسمان سنہری رنگ میں رنگ جاتا تو سلیم کے گھر کے صحن میں امید کی ایک نرم سی روشنی جگمگاتی۔ آسمان پر بادلوں کی ہلکی ہلکی لکیریں ایسے پھیلی ہوتی جیسے کسی مصور نے نیلے کینوس پر نرم برش پھیر دیا ہو۔ گلی کے کنارے پرانا نیم کا درخت ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کے پتوں کی سرسراہٹ میں موسیقی اتر رہی تھی۔ سلیم کے گھر کے صحن میں مٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

فاطمہ جب پانی کا چھڑکاؤ کرتی تو زمین سے اٹھتی خوشبو پورے ماحول کو سوندی سوندی خوشبو سے مہکا دیتی۔

پھر سلیم گھر میں داخل ہوتا تو ہاتھ میں ایک تھیلا گروسری سے بھرا ہوا فاطمہ کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ کھانا پک گیا بچے خوشی خوشی پوچھتے...تو بچے ماں سے کہنے لگے۔

امی آج گھر میں بہت اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ فاطمہ ان کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی اس کا دل پرسکون سا ہو جاتا۔

رات کے وقت جب کھانا تیار ہوا تو سب صحن میں بیٹھ گئے اوپر آسمان پر ستارے ایسے چمک رہے تھے جیسے کسی نے کالے مخمل پر چاندی کے ذرے بکھیر دیے ہو۔

سلیم نے روٹی کا ٹکڑا توڑا اور بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

دیکھو بیٹا...رزق چاہے تھوڑا ہو...اگر محنت اور حلال کا ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے۔

کھانے کے دوران گلی سے ایک بوڑھا فقیر گزرا اس نے سلیم سے کہا۔

بہت بھوکا ہوں کچھ کھانے کو ملے گا۔

سلیم نے روٹیوں کی چنگیر سے دو روٹیاں لیں اور دال کے ساتھ اس کو کھانا کھلایا اور وہ دعا دیتے ہوئے کہنے لگا۔

تمھارا گھر ہمیشہ آباد رہے...اور تمھارا رتبہ بلند ہو۔ اسی رات جب سب سو گئے تو فاطمہ کچھ دیر صحن میں بیٹھی رہی۔ آسمان پر چاند آہستہ آہستہ بادلوں کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ اس کی نرم میٹھی روشنی صحن میں ایسے پھیل رہی تھی جیسے امید کی کوئی خاموش کرن دلوں میں اتر رہی ہو۔

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی...سلیم سچ ہی تو کہتا تھا کہ مشکلیں تو آتی ہیں مگر اللہ روزی اور عزت دینے والا ہے۔ وہی حوصلہ بھی دیتا ہے اور ان شاء اللہ ہمارے اچھے دن بھی ضرور آئیں گے۔

اور یوں اس چھوٹے سے گھر میں جہاں کئی کئی روز چولہا نہیں جلتا تھا مگر اس گھر میں غربت کے باوجود ایک ایسی روشنی تھی جو بڑے بڑے محلوں میں بھی کم نظر آتی ہے۔ محبت، صبر اور خودداری کی۔

فاطمہ کا بھی حوصلہ بڑا بلند تھا۔ وہ بھی سلیم کی طرح اللہ پر بھروسہ رکھنے والی خاتون تھی۔

دیکھتے دیکھتے جہاں مکان تعمیر ہو رہا تھا وہاں ایک نہایت ہی عالی شان بنگلہ تعمیر ہو چکا تھا۔

سلیم نے مالک مکان سے عاجزی سے کہا۔

اب میرا کیا ہوگا۔ میرے بچے سکول میں پڑھتے ہیں اتنے روپے مل جاتے تھے کہ میں آسانی سے میرا گزارا ہو رہا تھا۔

مالک نے تھپکی دی اور کہا۔

کیا تم پڑھے لکھے ہو؟

جی میں نے بی اے کیا ہے....مگر آج تک کوئی ملازمت نہیں ملی تھی تو مزدوری خدا کی رضا سمجھ کر کرنے لگا تھا۔ نوکری اس ملک میں سفارش کے بغیر نہیں ملتی۔ میں بہت مجبور ہوں۔

سلیم تم بہت وفادار ہو....قدرت نے اتنا وفادار شخص دیا کہ میرا بنگلہ تمہاری محنت سے جلدی تعمیر ہو گیا۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں اپنی فرم پر نگران کی پوسٹ پر رکھ لیتا ہوں اور اچھی کارگردگی دکھائی تو تمھاری ترقی بھی کر دوں گا۔ مگر تم نے صرف اور صرف ایسی نگرانی کرنی ہے کہ ساری فرم کے لوگوں پر آنکھ رکھنی ہے....ہے تو بہت مشکل کام مگر امید کرتا ہوں تم کر لو گے۔ سلیم کا مارے خوشی سے چہرہ کھل اٹھا....اور آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب تھا کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں....میرا حوصلہ اور بھروسہ اور بھی بلند ہو گیا ہے۔

سلیم اتنی ایمانداری سے فرم میں کام کرتا....کہ ہر کوئی اس کی عزت کرتا....مالک نواز بخش تو اس پر مکمل بھروسہ کرتے تھے....بچے اچھے سکولوں کے بعد وہ کالج میں چلے گئے۔ بیٹے کی تعلیم کے بعد نواز بخش نے اس کو بڑی اچھی ملازمت دلوادی اور بیٹی کی اچھے گھرانے میں شادی بھی کروادی۔

نواز بخش نے اس کی محنت اور لگن دیکھ کر اسے اپنی فرم کا منیجر بنا دیا....دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گھر کے حالات بدل گئے۔

وہ حیران تھا۔ بھرپور اللہ پر بھروسہ رکھ کر اپنے آپ کو گمراہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ لاکھ گلی کے لوگوں نے اسے کہا تھا اپنی غربت دور کروں اور بھیک مانگوں روپیہ بنانے کا آسان طریقہ ہے۔ مگر وہ ثابت قدم رہا....اور جب چھوٹا سا اپنا نیا گھر بنایا تو فاطمہ کا خوشی کے مارے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کبھی ایسا سوچا نہیں تھا مگر اللہ پر اتنا مہربان ہو جائے گا جس نے ان کی کایہ ہی پلٹ دی تھی۔ رات کے وقت دونوں ٹیرس پر کھڑے تھے۔ چاند اور ستارے آسمان پر روشن تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ چاند بھی مسکراتے ہوئے ان کو گھر کی مبارک دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

،،پورا گھر تمھارا ہے،، [افسانچہ]

انھوں نے پھر دوبارہ شادی نہیں کی،،
...اور والدین کے گھر لوٹ آئیں، والدین
کا چھوڑا دو منزلہ مکان کافی کشادہ تھا جس
میں ان کا ایک بڑا خوبصورت کمرا تھا
شادی سے پہلے ہی وہ اس گھر کی زمین میں
بے پایاں محبت کی بیج کاری کر چکی تھیں، اور
کسی بہت اچھے عہدے پر برسرِ روزگار بھی تھیں،
علیحدگی کے بعد پہلا سوال یہ تھا کہ وہ رہنے
کے لیے بلڈنگ کے کس کمرے کو اپنائیں؟
......دونوں منزلوں کے تمام کمرے بھتیجوں
اور بھتیجیوں کے تصرف میں تھے..
بھابی، سامان کس کمرے میں رکھوں؟
انھوں نے پوچھا
،،کہیں بھی رکھ دو، میری جان، پورا گھر
تمھارا ہے،،
پھر بھی بھابھی، بچے ڈسٹرب نہ ہوں
اچھا، مدیحہ کے کمرے میں رکھ دو، ویسے بھی
تم کون سا پورا دن گھر پہ ہوتی ہو، آفس سے
ہی تمھیں فرصت نہیں ملتی
انھوں نے اپنا سامان بھتیجی کے کمرے میں
ٹھہرا لیا- شادی سے پہلے یہ کمرا انہی کا تھا
مدیحہ یونیورسٹی سے واپس آئی تو اپنے
کمرے میں اجنبی سامان دیکھ کر چیں بہ
جبیں ہوئی- ماں نے سمجھایا
چند دنوں کی بات ہے، بیٹا پھر پھوپھو سے کہیں
گے، اوپر والی منزل میں شفٹ کر جائیں
بھابی نے تو سرگوشی میں کہا تھا لیکن انھوں
نے سن لیا......
دو دن بعد اپنے دوسرے بھائی کو بتا کر وہ
ان کے پورشن میں اٹھ آئیں...
فیصلہ یہ ہوا انہیں بھائی کے منجھلے بیٹے کا کمرہ
دے دیا جائے، بھتیجے نے دبا دبا احتجاج
کیا،، بھائی نے کہا
چھوڑو یہ کمرہ...... گیسٹ روم میں منتقل
ہو جاو.. ویسے تو پورا گھر ہی تمھارا ہے..،،
.. شادی شدہ بھتیجی نے امید ظاہر کی،، پھوپھو
ابھی جوان ہیں، دوسرا گھر بسانا ان کا حق
ہے،،......وہ خاموش رہیں......اور اپنی سہیلی
کے گھر ایک محدود کمرے میں منتقل ہو گئیں
جہاں کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا
،،جہاں چاہے رہو، پورا گھر تمھارا ہے،،

☆☆☆☆☆

فرخندہ شمیم

The curse and catalyst

لعنت کا آغاز نہ کسی گرج سے ہوا تھا، نہ کسی پیش گوئی سے، بل کہ ایک ایسے فیصلے سے جو اتنا معمولی تھا کہ کبھی گناہ سمجھا ہی نہ گیا۔

یہ سرزمین کبھی فیاض تھی — دریا زندگی سے بھرپور، جنگلات پھلوں سے لدے ہوئے، آسمان کشادہ اور صاف۔ مگر بھوک کبھی زیادہ دیر تک مطمئن نہیں رہتی۔ توسیع کا مطالبہ کیا گیا۔ ترقی کی پوجا ہونے لگی۔ اور ''پیش رفت'' کے نام پر زندہ دنیا کو کاٹا گیا، موڑا گیا، جلایا گیا، اور اس طرح دوبارہ ترتیب دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو پہچاننا ہی چھوڑ بیٹھی جو خود کو اس کا حاکم سمجھتے تھے۔

اس کے بعد جو ہوا، وہ ایک لمحے کی سزا نہیں تھی، بل کہ ایک سست رفتار اصلاح تھی، جسے کسی نے تسلیم کرنا مناسب نہ سمجھا۔

سب سے پہلے آسمان بدلا۔

پرندے گرتے لگے۔

وہ خوف میں ٹکرا کر نہیں گرتے تھے، نہ ہی پرواز کے دوران تڑپتے دکھائی دیتے تھے — بل کہ یوں زمین پر آتے جیسے آسمان اچانک انھیں زندہ رکھنے کا طریقہ بھول گیا ہو۔ وہ بے ترتیب انداز میں گرتے، خشک زمین پر نرم آواز کے ساتھ، ایسی زمین جو اب کسی چیز کو نرمی سے قبول نہیں کرتی تھی۔

ابتدا میں لوگوں نے انہیں دفنایا۔ پھر چھوڑ دیا۔ پھر ان کے اوپر سے گزرنے لگے۔ آخر کار لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ اوپر دیکھنا، کھوئی ہوئی چیزوں کو یاد کرنا تھا۔

پھر مٹی بدل گئی۔

جو زمین کبھی زرخیز تھی، وہ سخت، بے جان اور دشمن بن گئی۔ خشک جڑی بوٹیاں اس میں سے ایسے اگتی تھیں جیسے الزام ہوں — باریک، نوکیلی، بے روح چیزیں، جو چھونے پر جلد کاٹ دیتی تھیں - کوئی خوراک باقی نہ رہی۔ یہاں تک کہ بارش بھی عجیب محسوس ہوتی — بہت بھاری،

سیدہ صائمہ جاوید
ترجمہ: امیر حسین جعفری

بہت ٹھنڈی، جیسے آسمان وہ سب واپس کھینچ رہا ہو جو اس سے چھینا گیا تھا۔

اور پھر لوگ بدلنے لگے، یا شاید زمین نے صرف یہ چھپانا چھوڑ دیا کہ وہ اصل میں کیا بن چکے تھے۔

اس سرزمین کی عورتیں سرد ہو گئیں۔ جذبات میں نہیں، بل کہ اپنی موجودگی میں۔ ان کے جسم تخلیق کے تصور کا جواب دینا چھوڑ گئے۔ ان کی کوکھیں مٹی کی طرح بنجر ہو گئیں — بیماری کے طور پر نہیں، بل کہ انکار کے طور پر۔ وہ گھروں اور ٹوٹی ہوئی گلیوں میں اپنی ہی پرچھائیوں کی طرح چلتی تھیں، صرف ضرورت کے وقت بولتیں، اور ان کی خاموشی غم سے بھی گہری تھی — جیسے آہستہ آہستہ مٹ جانا۔

مرد کچھ اور ہی بن گئے۔

تیز، غیر مستحکم، اور خطرناک۔

وہ ایسی سفاکی رکھتے تھے جو مشق شدہ لگتی تھی۔ بغیر کوشش کے فریب دیتے، بغیر جھجک کے بدعنوان ہوتے۔ انہوں نے جھوٹ پر مبنی نظام بنائے اور اسے نظم کا نام دیا۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہوتے جب فائدہ ہو، ساتھ کھڑے ہوتے جب ضرورت ہو، اور ہر اس چیز کو تباہ کر دیتے جو ان کے اختیار کے خلاف جاتی۔ مگر ان سب کے نیچے ایک خاموش اور ذلت آمیز حقیقت تھی: بے بسی۔ صرف جسمانی نہیں، تخلیق کی بے بسی۔ وہ قابو پا سکتے تھے، مگر قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ چھین سکتے تھے، مگر بنا نہیں سکتے تھے۔ ان کی طاقت بلند آواز تھی، مگر اندر سے اتنی کھوکھلی کہ اپنی بازگشت خود سنائی دیتی تھی۔

زمین ان کے انہدام کا آئینہ بن چکی تھی — بے جان، سخت، اور اپنی تباہی کو بار بار دہراتی ہوئی۔

پھر وہ لڑکی آئی۔

کسی کو یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ وہ چودہ یا پندرہ برس کی تھی، سفر سے کمزور ضرور، مگر ٹوٹی ہوئی نہیں۔ لوگوں کو سب سے زیادہ یہی بات بے چین کرتی تھی — اس کی طاقت نہیں، بل کہ اس کا اس دنیا جیسا نہ بننا۔ جہاں سب نظریں جھکاتے تھے، وہ سیدھا دیکھتی تھی۔ جہاں سب لمس سے بچتے تھے، وہ ہاتھ بڑھاتی تھی۔

وہ ایک ایسی بستی میں داخل ہوئی جو نرمی کا مفہوم بھول چکی تھی۔

اس دن بھی پرندے گر رہے تھے، آہستہ آہستہ، جیسے آسمان یادداشت خون کی صورت بہا رہا ہو۔ لوگ دروازوں اور ٹوٹی دیواروں سے اسے دیکھتے رہے، یہ توقع کرتے ہوئے کہ وہ چلی جائے گی، ٹوٹ جائے گی، یا اس جگہ کا اصول سیکھ لے گی: یہاں کچھ نہیں بدلتا، کیونکہ کچھ بدل نہیں سکتا۔

مگر وہ بستی کے کنارے موجود مردہ کھیت کی طرف گئی۔

وہ کھیت مقدس نہیں تھا، مگر خوف زدہ ضرور کرتا تھا— کیونکہ وہ مستقل ناکامی کا ثبوت تھا۔ وہاں کچھ نہیں اگتا تھا۔ حتیٰ کہ چیزیں صحیح طرح گلتی بھی نہیں تھیں۔ سب کچھ بس موجود رہتا تھا، شکست کے ثبوت کی طرح۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔

اس نے اپنی انگلیاں خشک مٹی میں دبائیں۔ زمین نے اس کی مزاحمت کی، جیسے بند ہونٹ۔ خشک جڑی بوٹیوں میں کہیں ایک کانٹے نے اس کی جلد کاٹ دی۔ خون کا ایک قطرہ زمین پر گرا۔

کچھ نہیں ہوا۔

فوراً تو نہیں۔

مگر اُس رات ایک پرندہ نہیں گرا۔

وہ چکر لگاتا رہا۔

صبح لوگوں نے یہ بات محسوس کی۔ یہی مسئلہ تھا۔ ایک ایسی جگہ میں جو بے حسی پر قائم ہو، محسوس کرنا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ موازنہ پیدا کرتا ہے۔ یادیں جگاتا ہے۔

مرد فوراً جمع ہو گئے۔ ان کی آوازیں تیز تھیں، قابو میں، مگر اندر سے ٹوٹتی ہوئی۔ خوف، جو منطق کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ غصہ، جو یقین کا بہانہ کر رہا تھا۔ ایک نے کہا لڑکی کو مار دینا چاہیے، اس سے پہلے کہ کچھ پھیل جائے۔ دوسرے نے کہا یہ محض اتفاق ہے۔ مگر دونوں باتیں ایک ہی چیز تھیں: کسی ایسی شے پر دوبارہ قابو پانے کی کوشش، جو اب قابو میں آنے سے انکار کر رہی تھی۔

عورتوں نے کچھ نہیں کہا۔

مگر وہ پہلے سے زیادہ دیر تک دیکھتی رہیں۔

لڑکی اگلے دن پھر آئی۔ پھر اس کے اگلے دن۔ وہ جو کچھ ڈھونڈ سکتی تھی، لاتی رہی— ٹوٹے برتنوں میں پانی، بھولی ہوئی جگہوں سے ملے بیج، کپڑے کے ٹکڑے تاکہ نازک کونپلوں کو ڈھانپ سکے جو اس زمین میں زندہ نہیں رہنی چاہئیں تھیں۔ زیادہ تر ناکام ہو گیا۔ کچھ نہ ہوا۔ مگر کچھ بچ گیا۔ اور یہی کافی تھا۔

ایک صبح پھٹی ہوئی زمین میں سبز رنگ کی باریک لکیر نمودار ہوئی۔ اتنی چھوٹی کہ شاید وہم لگتی— اگر وہم روشنی کی طرف جھک کر قائم رہ سکتا۔

مگر وہ قائم رہی۔

مردوں نے یہ برداشت نہیں کیا۔

ان کی سفاکی بڑھ گئی، اس لیے نہیں کہ وہ طاقتور ہو رہے تھے، بل کہ اس لیے کہ وہ طاقت کو پھسلتا محسوس کر رہے تھے۔ جھوٹ بڑھنے لگے۔ الزام پھیلنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کی بدعنوانیاں خود ظاہر کرنے لگے۔ ان کے بنائے ہوئے تمام نظام اپنی کھوکھلاہٹ ظاہر کرنے لگے۔ وہ اختیار جو خوف پر قائم تھا، ٹوٹنے لگا، جیسے ہی خوف مکمل نہ رہا۔

ایک آدمی نے کونپل کو کچلنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اس کا ہاتھ درمیان میں رک گیا۔
اس لیے نہیں کہ کسی نے روکا تھا۔
بل کہ اس لیے کہ اس کا جسم اب اُس یقین کی اطاعت نہیں کر رہا تھا جو کبھی اس کے اندر تھا۔
اس کی انگلیاں کانپیں۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، جیسے تباہ کرنا بھی اب اجنبی لگنے لگا ہو۔ وہ ہچکچاہٹ کسی حکم سے زیادہ تیزی سے پھیل گئی۔
وہیں سے اصل تبدیلی شروع ہوئی۔
عورتیں پہلی بار آگے بڑھیں — اتحاد میں نہیں، بل کہ ردعمل میں۔ ایک لڑکی کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری۔ ان کے ہاتھ مٹی کو چھونے لگے، پہلے ہچکچاہٹ سے، جیسے وہ کوئی بھولی ہوئی زبان یاد کر رہی ہوں۔
زمین نے جواب دیا۔
معجزے کی طرح نہیں، بل کہ اپنے اصول میں دراڑ ڈال کر۔ زمین کی سختی نرم ہونے لگی۔ جڑی بوٹیاں کاٹنے کے بجائے جھکنے لگیں۔ ہوا ہلکی محسوس ہونے لگی، جیسے کوئی بوجھ ڈھیلا پڑ گیا ہو مگر مکمل طور پر گیا نہ ہو۔
اوپر آسمان نے اپنی رفتار بدل دی۔
مردہ پرندوں کی بارش سست پڑ گئی۔
پھر رک گئی۔
مردوں نے دوبارہ اختیار جمانے کی کوشش کی، مگر ان کے احکام میں اب وہ یقین باقی نہ رہا۔ ان کی درندگی، جو کبھی طاقت سمجھی جاتی تھی، اب ننگی نظر آنے لگی — ایک مایوس تکرار، جس پر خود انہیں بھی یقین نہ تھا۔ یہاں تک کہ تشدد بھی کسی پرانی عادت کی نقل لگنے لگا۔
اور وہ لڑکی — جو اب بھی صرف چودہ یا پندرہ برس کی تھی — کسی کی رہنما نہیں بنی۔
مگر اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔
بوائی کرتی ہوئی۔ واپس آتی ہوئی۔ اُن چیزوں کو چھوتی ہوئی جن سے سب بچتے تھے۔ اس خیال کو ماننے سے انکار کرتی ہوئی کہ زوال ہمیشہ رہتا ہے۔
اس کا یہ انکار پھیلنے لگا، ایسے طریقوں سے جنہیں کوئی مکمل طور پر سمجھ نہ سکا۔
سبزے کا دوسرا ٹکڑا نمودار ہوا۔ پھر تیسرا۔ پرندے دوبارہ اُڑنے لگے، پہلے غیر یقینی سے، پھر آہستہ آہستہ ایسے جیسے وہ خود بھی آسمان کا مطلب دوبارہ سیکھ رہے ہوں۔
زمین ایک ہی لمحے میں ٹھیک نہیں ہوئی۔ وہ شفا کی مزاحمت کرتی رہی، جیسے کوئی چیز طویل بیماری سے جاگ رہی ہو اور امکان کی واپسی پر حیران ہو۔
سب کچھ راتوں رات نرم نہیں ہوا۔
مگر مروج طریقہ کار جیسے شکست و ریخت کا شکار ہو گیا۔
اور ایک ایسی دنیا میں جو تباہی پر قائم تھی، زندگی کا سب سے چھوٹا تسلسل بھی، ایک اختتام کی ابتدا بن گیا۔

☆☆☆☆☆

روشنی کا پُل

شام کی روشنی جہلم کے پانی پر رقصاں تھی۔ ہَوا میں دن کے شور کو شکست دینے والا نرم سکوت لہرا رہا تھا۔ پارک کے درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے، اور پروفیسر کا ہلکے سیاہ رنگ کا کتا زیوس گلہریوں کے پیچھے بھاگنے کی اپنی روز کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا۔

جہلم کے پار ایک لکڑی کا پل تھا— طویل، خاموش، پانی پر جھکا ہوا۔ ڈھلتے سورج کی الوداعی کرنیں اس پر ایسے بکھر رہی تھیں جیسے کسی نے پانی اور پل کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی ہو۔

صوفی آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے قدموں میں وہی ٹھہراؤ تھا جو اس کی گفتگو میں بھی ہوتا تھا۔ پروفیسر اس کے ساتھ تھا، ہاتھ جیبوں میں، نظریں کبھی پانی پر، کبھی زیوس پر، اور کبھی اس پل پر جو سُنہری ساعت کی جھلمل میں کسی طلائی جھالر کی طرح چمک رہا تھا۔

''کل مراقبے میں عجیب کیفیت ہوئی،'' صوفی نے کہا۔ اس کی آواز میں کوئی دعویٰ نہیں تھا، صرف ایک اظہار۔

''کیفیت؟ یا ذہن کی کوئی پرانی شرارت؟'' پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

صوفی نے جہلم کی طرف دیکھا۔ پانی پر روشنی کی لکیر اور پل کی لکیر اب بھی ایک جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔

''جو چیز لفظوں میں نہ سمائے، وہی اصل ہے۔''

''اصل وہ ہے جسے ماپا جا سکے۔ باقی سب احساسات ہیں۔ دماغ کے کھیل۔ ذہن کی کرشمہ سازیاں!'' پروفیسر نے کہا۔

زیوس اچانک ایک چپ منک کے پیچھے بھاگا۔ صوفی ایک قدم پیچھے ہٹا اور خود پر ہنس پڑا۔ ''میں ڈرتا نہیں ہوں— بس یونہی چونک جاتا ہوں۔''

''یہ بے چارہ تو معصوم سا جانور ہے۔''

''خوف بھی کبھی کبھی جانور کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،'' صوفی نے کسی گہرائی سے

حامد یزدانی

ابھرتے ہوئے کہا۔

پھر اس کے اندر کوئی صدا لہرائی: ''عجیب بات ہے، آج پروفیسر کی بات میں مجھے وزن محسوس ہوا۔ شاید دل بھی کبھی کبھی دلیل طلب کرتا ہے۔''

''تم مراقبے میں کیا دیکھتے ہو؟''

''روشنی ... مگر وہ روشنی باہر کی نہیں ہوتی۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں، وہ دماغ کی ہے۔''

''اور میں کہتا ہوں کہ وہ دل میں ہوتی ہے۔''

پروفیسر نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔

''دل — تم لوگ دل کو بہت اہمیت دیتے ہو۔''

صوفی نے کہا، ''میں داتا کی نگری سے ہوں۔ وہاں دل کا راستہ پہلے دکھایا جاتا ہے، دماغ کا بعد میں۔''

''داتا کی نگری! اور میں سینٹ جیکبز ٹاؤن سے ہوں۔ تو—!؟'' پروفیسر شرارت پر آمادہ تھا۔

مگر صوفی کسی اور ہی بستی میں گھوم رہا تھا:

''وہاں کی فضا میں ایک عجیب سی روشنی ہوتی ہے۔ دربار کے صحن میں بیٹھے فقیروں کی نورانی صدا سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ شاید اسی لیے میں مراقبے میں روشنی دیکھتا ہوں۔''

یہ مکالمہ تھا یا خود کلامی؟ شام کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔

وہ دونوں چلتے رہے۔ زیوس اب ان کے درمیان چل رہا تھا جیسے وہ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو۔

دور پل پر ایک نوجوان جوڑا جاگنگ کر رہا تھا، ان کے قدموں کی آواز پانی کی جھلمل میں گھل رہی تھی۔

اسی ملگجی خاموشی میں وہ پروفیسر کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تو اندر سے الائچی، پیاز اور کسی پرانی تہذیب جیسے مسالوں کی خوشبو برآمد ہوئی — اور پھر پروفیسر کی بیوی۔

''آداب۔ آداب، آیئے، سموسے ابھی نکالے ہیں۔ چائے بھی تیار ہے۔'' اس کی آواز میں لکھنؤ کی تہذیب تھی — نرمی، احترام اور شائستگی۔

''آداب،'' صوفی نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔

گھر میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے کسی نے دعاؤں کو احتیاط سے ترتیب دے کر یہاں وہاں سجا دیا ہو۔

ان کے میز کے گرد بیٹھتے ہی زیوس بھی دبیز ترک قالین پر لیٹ گیا۔

پروفیسر نے چائے انڈیلی۔ بیوی نے چائے دانی اٹھائی۔

''چینی کم تو نہیں؟'' اس نے پوچھا

''آپ کے ہاتھ کی چائے میں ترمیم کی جسارت میں تو کر نہیں سکتا،'' صوفی نے کہا۔

بیوی مسکرا دی۔

''آپ نے ان دنوں کچھ تازہ کہا ہو تو سنایئے،'' صوفی نے کہا۔

''جی، ایک ادھوری نظم کے چند مصرعے

سنائے دیتی ہوں۔''

وہ سنانے لگی:

''زندگی، زندگی ہے

یہ بازی نہیں ہے،

یہاں جیتنا ہارنا کچھ نہیں

اک سفر ہے کسی روشنی کی طرف

سامنے ہے وہ پُل خواب سا

کشتیوں سے اترنا ہے سب کو

اسے پار کرنا ہے سب کو۔''

صوفی اور پروفیسر نے داد دی۔ بیوی کچن میں چلی گئی۔

پروفیسر کے اندر ایک بازگشت اٹھی: ''صوفی کہتا ہے روشنی دل میں ہوتی ہے... اور آج اس کے لہجے میں مجھے کوئی ضد نہیں، صرف سچائی محسوس ہوئی۔ کیا دل کی بھی کوئی حقیقت ہو سکتی ہے؟''

پھر اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا: ''مذہب پر تو میرا یقین نہیں، صوفی... مگر اس دیوی کا میں بہرصورت پجاری ہوں۔ اسی کے وجود کا سکون ہے یہ۔''

''دیوی!؟'' صوفی چونکا۔

''ہاں۔ ان سے میں نے مشرقی تہذیب سیکھی، خاموشی میں بسر کرنے کا سلیقہ، اور محبت کا ہنر۔ یہ کہتی ہیں محبت کا م نظام بحث سے نہیں، تواضع سے چلتا ہے۔''

صوفی نے نظریں جھکا لیں۔ جیسے کوئی پرانی دیوار اس کے اندر ہل گئی ہو۔

''مگر میں مراقبے میں جس روشنی کو دیکھتا ہوں... وہ محبت نہیں۔ وہ کچھ اور ہے۔''

''اگر ہے، تو اسے ثابت کرو،'' پروفیسر نے کہا۔

''اور جس کا تمھیں علم نہیں، اسے جھٹلانے کا حق تمھیں کیسے ملا؟'' صوفی بولا۔

پروفیسر جھنجھلا گیا۔

اسی لمحے زیوس نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے صوفی کے پاؤں پر رکھ دیا۔ صوفی نے اسے سہلایا— شاید کسی اندرونی خوف کی کایا پلٹ رہی تھی۔

پروفیسر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ باہر جھیل پر روشنی مدھم ہو چکی تھی۔

''کبھی کبھی لگتا ہے سائنس بھی سب کچھ نہیں جانتی،'' اس نے کہا۔

''اور مجھے تو اکثر لگتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا،'' صوفی نے کہا۔

دونوں ہنس پڑے— نہ جیت، نہ ہار... صرف دوستی کی مہک۔

بیوی نے کچن سے جھانکا اور سوچا: ''یہ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے یا اپنے اندر کی آوازوں سے؟ شکر ہے بدل رہے ہیں... اور میں بھی تو کتنی بدل چکی ہوں۔ شاید اسی کو زندگی کہتے ہیں— ایک خاموش تواضع، ایک بے لوث خدمت۔''

شام گہری ہو چکی تھی۔ صوفی نے رخصت لی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر

دیکھا — پروفیسر کھڑکی کے پاس، بیوی برتن دھونے میں مگن، اور گھر میں وہی سکون جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا۔

جھیل کی طرف جاتے ہوئے اس کے اندر ایک خیال گونجا: ''پروفیسر نے کہا تھا کہ کبھی کبھی ذہن بھی خاموشی چاہتا ہے... آج پہلی بار یہ بات سچی لگی۔''

پل پر چاندنی کی باریک پٹی چمک رہی تھی — اور پانی میں اس کا عکس۔ دونوں لکیریں جیسے ایک دوسرے کو پہچان کی کوشش کر رہی ہوں۔

صوفی نے آنکھیں بند کیں۔ روشنی اندر اترنے لگی — وہی روشنی جو وہ مراقبے میں دیکھتا تھا۔

پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔

پروفیسر تھا، اور زیوس بھی۔ وہ دونوں کے درمیان بیٹھ گیا — اپنے پسندیدہ مقام پر، محبت کا پُل بن کر۔

پروفیسر نے آہستہ سے کہا، ''یہ روشنی... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ روشنی باہر بھی ہو اور اندر بھی۔''

''روشنی کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے — بس دیکھنے والے کے زاویے کی بات ہے،'' صوفی نے کہا۔

اسی لمحے پروفیسر کی بیوی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا چراغ تھا — لکھنؤ کی روایت۔ اس نے چراغ جھیل کے کنارے رکھا اور کہا: ''روشنی کو جہاں بھی رکھ دیں، یہ اپنا راستہ خود تراش لیتی ہے۔''

چراغ کی لو سیدھی ہو گئی — جیسے تینوں کے درمیان کوئی خاموش فیصلہ ہو گیا ہو۔

پروفیسر سوچ رہا تھا: ''صوفی کہتا ہے روشنی دل میں ہوتی ہے... اور آج جھیل کے کنارے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ شاید دل بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے۔''

بیوی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور مسکرا دی۔

جھیل کی سطح پر کھنچی چاندنی کی لکیر اور پل کی لکیر اب ایک سیدھے، نرم، خاموش انداز میں ایک دوسرے میں گھل رہی تھیں۔ ایک نئی روشنی جنم لے رہی تھی۔

اور تین ہیولے — اس روشنی کے سامنے — ایک ہی کہانی میں ڈھل گئے تھے۔

زیوس نے سر اٹھایا، پل کی طرف دیکھا، پھر آسمان کی طرف — اس کی آنکھیں دو جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔

بیوی کی نظم کی بازگشت پھر گونجی:

''زندگی، زندگی ہے یہ بازی نہیں ہے،
یہاں جیتنا ہارنا کچھ نہیں
اک سفر ہے کسی روشنی کی طرف
سامنے ہے وہ پُل خواب سا
کشتیوں سے اترنا ہے سب کو
اسے پار کرنا ہے سب کو۔''

اب کے چراغ کی لو گنگنا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

گہری خاموشی

سوشل میڈیا کے سب سے معتبر اور پرہجوم ادبی گروپ ''بزمِ ادب و آگہی'' میں پچھلے تین دن سے ایک طوفان برپا تھا۔ موضوع تھا: ''اردو افسانے میں مابعد جدیدیت اور ساختیاتی شکست و ریخت۔'' اس ثقیل اور گراں بار موضوع پر ایک طویل، بوجھل اور پیچیدہ مضمون پوسٹ کیا گیا تھا جس نے بظاہر گروپ کے تمام ممبران کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر اس ساری بحث کے دو ہی درخشاں ستارے تھے: شبلی اور اقبال۔

شبلی نے کمنٹ سیکشن میں ایک نیا محاذ کھولتے ہوئے لکھا تھا:

''اقبال صاحب! آپ کے پیش کردہ تنقیدی شعور نے دریدا کی روح کو گویا مہمیز کر دیا ہے۔ آپ کی رد تشکیل کی تھیوری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ متن اپنے اندر موجود خالی جگہوں سے خود کلامی کر رہا ہے۔ آپ کی بصیرت کا اعتراف نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔''

چند ہی لمحوں بعد اقبال کا جوابی کمنٹ نمودار ہوا:

''شبلی بھائی! آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے پچھلے مضمون میں رولاں بارتھ کے ''مصنف کی موت'' کے نظریے پر جو اسلوبیاتی گرفت نظر آئی، وہ ہمارے عہد کے نام نہاد نقادوں کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا قلم تنقید کی وہ شمشیرِ برہنہ ہے جو فرسودہ بیانیوں کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔''

یہ دونوں ایک دوسرے کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ پڑھنے والے قارئین رشک اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان دونوں ''دانشوروں'' کی علمیت پر عش عش کر رہے تھے مگر اس ڈیجیٹل سراب کے پیچھے چھپی حقیقت اتنی ہی بھیانک تھی جتنا کسی خوب صورت چہرے پر پڑا ہوا تیزاب کا داغ۔

حقیقت یہ تھی کہ نہ شبلی کو دریدا کے ہجے معلوم تھے اور نہ اقبال کو رولاں بارتھ کی تاریخِ پیدائش کا علم تھا۔ دونوں کے براؤزر میں دوسرے ٹیب پر ''مصنوعی ذہانت'' کا ٹول کھلا رہتا تھا۔ وہ گروپ سے کسی کا کمنٹ کاپی کرتے اسے کمانڈ دیتے کہ ''اس کا ایک انتہائی عالمانہ، پیچیدہ اور ادبی اردو میں جواب لکھو جس میں مغربی فلسفیوں کا حوالہ ہو'' اور پھر وہاں سے کاپی کر کے تھوڑی سی کاٹ چھانٹ کے بعد گروپ میں پیسٹ کر دیتے۔ دونوں اپنے اپنے خول میں مست تھے اور اس زعم میں مبتلا تھے کہ دوسرا ان کی

عمار نعیمی

''علمیت'' سے مرعوب ہو چکا ہے۔

اسی شام لاہور کے ایک خستہ حال، دھویں سے اٹے ہوئے اور شور و غل میں ڈوبے ہوئے چائے خانے پر ان دونوں کی ملاقات طے تھی۔ یہ چائے خانہ پرانے ادیبوں کی آماجگاہ ہونے کا دعویدار تھا مگر اب یہاں صرف سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے، دیواروں سے اکھڑتا ہوا زرد روغن، سیلن کی ناگوار بُو اور پیالیوں سے ٹکراتے پیالوں کی جلترنگ ہی باقی رہ گئی تھی۔

شبلی چائے خانے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک سستی سی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی جس پر سے مصنوعی چمڑے کی پرتیں جھڑ رہی تھیں۔ اس کے بالوں میں تیل کی چمک تھی اور چہرے پر ایک متکبرانہ مسکراہٹ جیسے وہ ابھی ابھی کسی عالمی کانفرنس سے خطاب کر کے آ رہا ہو۔

سامنے ہی ایک کونے والی میز پر اقبال بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چائے کا ایک خالی کپ، پانی کا ایک گلاس اور کچھ بے ترتیب کاغذات بکھرے ہوئے تھے جو اس نے محض اپنی دانشوری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے پھیلا رکھے تھے۔

''آیئے آیئے قبلہ شبلی صاحب! چشمِ ما روشن دلِ ما شاد!'' اقبال نے قدرے تکلف سے اٹھتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

''ارے اقبال بھائی! کیسے ہیں آپ؟ بس ٹریفک کا جو حال ہے خدا کی پناہ! مال روڈ پر تو جیسے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔'' شبلی نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دونوں کے ذہنوں میں سوشل میڈیا پر چلنے والی وہ طویل، فلسفیانہ اور پیچیدہ بحث گونج رہی تھی۔ اصولاً انھیں اب مابعد جدیدیت، ساختیات اور متن کی تہوں پر بات کرنی چاہیے تھی لیکن دونوں کے دلوں میں ایک چور بیٹھا تھا کہ اگر موضوع بحث ادب بن گیا تو قلعی کھل جائے گی اور ان کی نام نہاد علمیت کا غبارہ بیچ چوراہے میں پھٹ جائے گا۔

''یار شبلی...'' اقبال نے اچانک کھنکارتے ہوئے خاموشی توڑی ''چھوڑو ان ادبی جھمیلوں کو اور یہ بتاؤ آج کل بجلی کے بلوں کا کیا عذاب نازل ہو رہا ہے؟ پچھلے مہینے پینتیس ہزار بل آیا ہے۔ قسم لے لو جو ایک اے سی بھی چلایا ہو۔ غریب آدمی تو جیتے جی مر گیا ہے۔''

شبلی، جو اس بات سے خوفزدہ تھا کہ کہیں اقبال اس سے دریدا کے بارے میں نہ پوچھ لے اس دنیاوی موضوع پر فوراً لٹو ہو گیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا، ایک لمبا کش لیا اور دھواں چھت کی طرف اچھالتے ہوئے بولا:

''ارے بھائی! مت پوچھو مہنگائی نے تو جیسے عام آدمی کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہے۔ آٹے اور دال کا بھاؤ تو آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ کل بیگم سے اسی

بات پر ایسی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی کہ میرا تو بلڈ پریشر ہی شوٹ کر گیا۔ عورتوں کو تو بس یہ لگتا ہے کہ ہم مرد باہر جا کر نوٹ چھاپنے کی مشین چلاتے ہیں۔''

اقبال نے فوراً تائید میں سر ہلایا جیسے کسی بہت بڑے فلسفیانہ نظریے کی تصدیق کر رہا ہو۔ ''بالکل بالکل! یہ بیویاں بھی نا بس مطالبات کی ایک نہ ختم ہونے والی فہرست ہیں۔ میری والی کا تو سارا دن یہی رونا رہتا ہے کہ بچوں کی فیسیں، کپڑے، جوتے۔ یار میں ایک دانشور آدمی ہوں مجھے تنہائی چاہیے، سکون چاہیے اور یہ مجھ سے پیاز اور ٹماٹر منگواتی رہتی ہے۔''

شبلی نے ایک معنی خیز اور قدرے بے ہودہ مسکراہٹ کے ساتھ میز پر جھکتے ہوئے آواز دھیمی کی ''لیکن یار اقبال... ایک بات بتاؤں؟ ان گھریلو جھنجھٹوں سے فرار کا میں نے ایک بہترین راستہ نکال لیا ہے۔''

''وہ کیا؟'' اقبال کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''وہ جو ہماری فیکلٹی میں نئی لیکچرر آئی ہے نا... سائرہ؟ ارے وہی جس کی آنکھیں بلی جیسی ہیں۔'' شبلی نے آنکھ ماری۔ ''آج کل اس کے ساتھ میرا اچھا خاصا سلسلہ چل رہا ہے۔ کل ہی مجھے اس کا وائس نوٹ آیا، کہتی ہے، 'شبلی صاحب! آپ کی باتیں سیدھی دل میں اترتی ہیں'۔ اب تمھیں تو پتا ہے اپنا بھی کیا کمال کا سحر ہے!''

اقبال نے ایک قہقہہ لگایا جو اس کے آن لائن سنجیدہ اور فلسفیانہ چہرے سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ''واہ بھئی شبلی! تم تو چھپے رستم نکلے۔ یہاں تو ہماری دال کہیں نہیں گل رہی اور تم روزنئی دیگیں چڑھا رہے ہو۔ ویسے سائرہ ہے تو غضب کی چیز کل میں نے بھی اسے کوریڈور میں دیکھا تھا۔''

دونوں دیر تک اسی قسم کی بازاری اور سطحی گفتگو میں الجھے رہے۔ عورتوں کے قصے، مہنگائی کا رونا، فیکلٹی کی سیاست اور دوستوں کی غیبت۔ ان کی گفتگو میں نہ کہیں کوئی استعارہ تھا نہ تشبیہ اور نہ ہی کسی عالمی ادب کا کوئی شائبہ۔ وہ دونوں محض گوشت پوست کے دو کھوکھلے انسان تھے جو اپنی اپنی دانشوری کا لبادہ سوشل میڈیا پر ہی چھوڑ آئے تھے۔

اچانک شبلی کا موبائل بجا۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ گروپ میں اقبال کے ایک گھنٹہ پہلے کیے گئے کمنٹ پر کسی اور نے نہیں بل کہ گروپ کے سب سے معمر اور مستند نقاد پروفیسر نطشے صاحب نے ایک لمبا چوڑا اعتراض اٹھا دیا تھا۔ نطشے صاحب نے اقبال کی تھیوری کو بچگانہ قرار دیتے ہوئے چند کڑے سوالات پوچھے تھے۔

شبلی کے دل میں شرارت جاگی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اقبال کی تھوڑی اور ''مصنوعی'' تعریف کر دی جائے تاکہ اس کی دانشوری کا بھرم اور پختہ ہو۔

اس نے اقبال کی طرف دیکھا جو خود بھی اپنا

موبائل نکال کر میز کے نیچے سے سکرین گھور رہا تھا۔ دراصل اقبال کو بھی نطشے صاحب کے اعتراض کا نوٹیفکیشن مل چکا تھا اور وہ پریشان تھا کہ اب کیا جواب دے۔

''یار اقبال تم ذرا چائے والے کو تو آواز دو ایک ایک کپ اور ہو جائے۔'' شبلی نے بہانہ بناتے ہوئے اپنا فون میز کے نیچے کیا اور جلدی سے براؤزر کھول کر مصنوعی ذہانت کا ٹول اوپن کیا۔ اس نے نطشے صاحب کا پورا کمنٹ کاپی کیا اور اے آئی کو پرامپٹ دیا:

''اقبال کی پوسٹ کی تعریف کرتے ہوئے اور بھاری بھرکم ادبی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے پروفیسر نطشے کے استدلال کو مکمل طور پر رد کرنے والا ایک انتہائی عالمانہ اور فلسفیانہ جواب اردو میں لکھیں۔''

اسی دوران اقبال نے چائے والے کو اشارہ کیا اور خود بھی عجلت میں اپنے فون پر مصنوعی ذہانت کو کھول لیا۔ اس نے بھی نطشے صاحب کا کمنٹ کاپی کیا اور پرامپٹ لکھا:

''جدید نقادوں کے اقوال کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر نطشے کے مقابلے میں میرے نظریے کا دفاع کرنے کے لیے اردو میں ایک عاجزانہ مگر گہرائی سے بھرپور عالمانہ جواب لکھیں۔''

چائے خانے کا شور وغل جاری تھا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں بمشکل دو فٹ کا فاصلہ تھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے بڑی تیزی سے اپنے اپنے موبائل کی سکرینوں پر انگلیاں چلا رہے تھے۔ نیلی روشنی ان کے چہروں کی جھریاں اور ان کی منافقت کو نمایاں کر رہی تھی۔

اے۔ آئی نے دونوں کو فوراً شاندار قسم کے اردو پیراگراف بنا کر دے دیے۔ دونوں نے جلدی سے متن کو سلیکٹ کیا، کاپی کیا اور گروپ کے اسی تھریڈ میں پیسٹ کر کے سینڈ کا بٹن دبا دیا۔

دونوں نے تقریباً ایک ہی وقت میں اطمینان کا سانس لیا۔ فون میز پر الٹے رکھے اور ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر وہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی جو کسی معرکہ سر کرنے کے بعد آتی ہے۔

''ہاں تو شبلی... کیا کہہ رہے تھے تم سائرہ کے بارے میں؟'' اقبال نے بات وہیں سے جوڑنی چاہی اور میز پر رکھی سگریٹ کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ابھی شبلی نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک...

ٹنگ... ٹنگ... ٹنگ...

دونوں کے موبائل فونز پر ایک ساتھ نوٹیفکیشنز کی ٹون بجنا شروع ہو گئی۔ دونوں نے چونک کر اپنے فون سیدھے کیے۔ فیس بک ایپ پر دھڑا دھڑ کمنٹس آ رہے تھے۔

پروفیسر نطشے صاحب نے ایک نیا کمنٹ کیا تھا اور اس میں شبلی اور اقبال دونوں کو ٹیگ کیا تھا۔

شبلی نے دھڑکتے دل کے ساتھ نطشے صاحب

کا کمنٹ پڑھنا شروع کیا اور جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اقبال کا بھی وہی حال تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ کانپنے لگا۔

نطشے صاحب کا کمنٹ کچھ یوں تھا:

"شبلی اور اقبال صاحبان! آپ دونوں کی نام نہاد علمیت، ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کا جنازہ آج اس گروپ کے بیچ چوراہے میں نکل چکا ہے۔ میں پچھلے تین دن سے آپ دونوں کی یہ تماشا گری دیکھ رہا تھا۔ آپ نے جو جوابات ابھی ابھی پوسٹ کیے ہیں، ان کی زبان، ان کا لہجہ اور ان کی ساخت بالکل ایک جیسی ہے۔ مگر اس سے بھی بڑا المیہ جو آپ دونوں کی ادبی موت کا پروانہ ہے؛ وہ یہ ہے کہ آپ دونوں اندھی تقلید اور کاپی پیسٹ کی جلد بازی میں وہ آخری سطر مٹانا بھول گئے ہیں جو آپ کی سکرینوں پر نمودار ہوئی تھی۔ ذرا اپنے اپنے کمنٹس کے بالکل آخر میں تو دیکھیے! کیا خوبصورت اردو ادب تخلیق کیا ہے آپ دونوں نے!"

شبلی اور اقبال کے دل سینے سے نکل کر حلق میں آ گئے۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ چکے تھے۔ دونوں نے کپکپاتی انگلیوں سے اپنے اپنے کمنٹس کو سکرول کر کے سب سے نیچے دیکھا۔

ان دونوں کے پیچیدہ، فلسفیانہ اور عالمانہ اردو پیراگراف کے بالکل آخر میں من وعن حرف بہ حرف ایک ہی انگریزی جملہ چمک رہا تھا جسے وہ کاپی کرتے وقت مٹانا بھول گئے تھے:

"As an AI language model, I do not have personal opinions but I hope this response meets your literary requirements."

چائے خانے کا شور جیسے ایک دم سے تھم گیا۔ چمچوں کی جلترنگ، دھوئیں کے مرغولے اور ٹریفک وغیرہ سب کچھ ان دونوں کے لیے منجمد ہو گیا تھا۔

شبلی نے دھیرے سے سر اٹھا کر اقبال کی طرف دیکھا۔ اقبال کی نظریں بھی اسی کی طرف اٹھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے وہ ننگی کھوکھلی اور کریہہ حقیقت جھلک رہی تھی جو اب تک ادبی اصطلاحات کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔

وہ دونوں جو ایک دوسرے کو عظیم نقاد سمجھتے تھے درحقیقت ایک ہی حمام میں نہا رہے تھے اور آج پہلی بار ان دونوں نے ایک دوسرے کو حمام میں برہنہ دیکھا تھا۔

میز پر رکھی چائے کی پیالیوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھی اور ان کے درمیان ایک ایسی بھیانک، اذیت ناک اور گہری خاموشی چھا گئی جسے توڑنے کے لیے اب کسی مصنوعی ذہانت کے پاس بھی کوئی الفاظ نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆

لومڑی کی توبہ

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک سرسبز اور خوبصورت جنگل تھا۔ اس جنگل میں طرح طرح کے جانور رہتے تھے۔ کہیں ہرن دوڑتے پھرتے تھے، کہیں خرگوش کھیلتے کودتے تھے، کہیں بندر درختوں پر جھولتے تھے اور کہیں رنگ برنگے پرندے چہچہاتے رہتے تھے۔ جنگل اپنی خوبصورتی اور خوش حالی کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا۔

مگر اسی جنگل میں ایک لومڑی بھی رہتی تھی۔ وہ لومڑی بہت چالاک، مکار اور خود غرض تھی۔ اسے دوسروں کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ کبھی خرگوش کو دھوکا دیتی، کبھی ہرن کو پریشان کرتی، کبھی بندروں کے درمیان جھگڑا لگوا دیتی اور کبھی پرندوں کے گھونسلوں کے قریب جا کر انہیں ڈرا دیتی۔

جنگل کے تمام جانور اس کی حرکتوں سے بہت تنگ آ چکے تھے۔ کوئی بھی جانور اس پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ جب وہ کسی کے قریب آتی تو جانور فوراً محتاط ہو جاتے۔

ایک دن خرگوش نے افسوس سے کہا:

"کاش لومڑی اپنی عادتیں بدل لے۔"

ہرن نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا:

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کبھی بدلے گی۔"

بندر بولا:

"جو دوسروں کو تکلیف دے، آخر ایک دن اسے خود بھی اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔"

مگر لومڑی کو کسی کی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی چالاکیوں میں مگن رہتی تھی۔

ایک صبح لومڑی بہت بھوکی جاگی۔ رات سے اس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ اس نے سوچا:

"آج تو مجھے ضرور کوئی اچھا شکار مل جائے گا۔"

وہ کھانے کی تلاش میں جنگل کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گھومتی رہی۔ کبھی

ملک نعمان حیدر حامی

جھاڑیوں میں جھانکتی، کبھی درختوں کے نیچے دیکھتی، کبھی کسی راستے پر چل پڑتی، مگر اسے کہیں بھی کھانے کو کچھ نہ ملا۔

سورج آسمان پر بلند ہو گیا۔

گرمی بڑھنے لگی۔

لومڑی کی بھوک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ تھک چکی تھی لیکن پھر بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

کافی دیر بعد وہ جنگل کے ایک ایسے حصے میں پہنچ گئی جہاں وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی۔

وہاں ایک پرانا اور بلند بیر کا درخت کھڑا تھا۔

درخت کے ساتھ ایک بیل لپٹی ہوئی تھی جو اوپر تک چڑھی ہوئی تھی۔

اچانک لومڑی کی نظر بیل پر پڑی۔

اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

بیل پر ایک عجیب سا پھل لٹک رہا تھا۔ وہ شکل میں خربوزے جیسا تھا اور اس کا رنگ سنہرا پیلا تھا۔ سورج کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی جس سے وہ اور بھی دل کش نظر آ رہا تھا۔

لومڑی نے خوش ہو کر کہا:

''واہ! آج تو قسمت مجھ پر مہربان ہو گئی۔''

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

اس نے سوچا:

''یہ پھل یقیناً بہت میٹھا ہوگا۔ اگر میں اسے کھا لوں تو میری ساری بھوک ختم ہو جائے گی۔''

لومڑی پھل کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے اوپر دیکھا۔

پھل کافی اونچائی پر تھا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ ایک چھلانگ میں شاید وہ اسے حاصل نہ کر سکے۔

چنانچہ اس نے منصوبہ بنانا شروع کیا۔

وہ بیل کے اردگرد چکر لگانے لگی۔

کبھی ایک طرف سے دیکھتی، کبھی دوسری طرف سے۔

پھر اس نے پہلی چھلانگ لگائی۔

مگر پھل بہت دور تھا۔

وہ زمین پر آ گری۔

اس نے دوسری چھلانگ لگائی۔

پھر بھی کامیابی نہ ملی۔

تیسری بار اس نے زیادہ زور لگایا لیکن پھر ناکام رہی۔

اب وہ ہانپنے لگی تھی۔

مگر لالچ اس پر غالب تھا۔

وہ خود سے بولی:

''نہیں! میں ہار نہیں مانوں گی۔ یہ پھل مجھے ضرور حاصل کرنا ہے۔''

اس نے کچھ دیر آرام کیا۔

پھر کافی دور جا کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے پوری طاقت سے دوڑ لگائی۔

دوڑتے ہوئے اس نے زور دار چھلانگ لگائی۔

اس بار اس کے پنجے بیل تک پہنچ گئے۔

وہ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی اوپر چڑھ گئی اور

آخر کار اس نے وہ پھل توڑ لیا۔
خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
''آخر کار کامیابی مل ہی گئی!'' وہ خوشی سے بولی۔
حیران کن انجام
لومڑی نے جلدی سے پھل کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔
مگر اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔
پھل انتہائی کڑوا تھا۔
اتنا کڑوا کہ اس کی زبان سن ہونے لگی۔
اس نے فوراً پھل تھوک دیا۔
"اوہ! یہ کیا تھا؟"
وہ چیخی۔
مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔
پھل کے اندر کوئی ایسی چیز تھی جس نے اسے چکرا دیا۔
اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔
درخت، جھاڑیاں اور راستے سب گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔
وہ لڑکھڑانے لگی۔
"مجھے... کیا... ہو رہا ہے؟"
وہ بمشکل بول سکی۔
کچھ ہی لمحوں بعد وہ زمین پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔
دوسری طرف جنگل میں ایک عجیب بات ہو رہی تھی۔
پورا دن گزرنے لگا مگر کسی جانور نے لومڑی کو نہیں دیکھا۔
خرگوش نے حیرانی سے کہا:
''آج لومڑی کہیں نظر نہیں آئی۔''
بندر بولا:
''واقعی! یہ تو عجیب بات ہے۔''
ہرن نے سوچتے ہوئے کہا:
''وہ روز کسی نہ کسی کو تنگ کرتی تھی۔ آج پورا دن گزر گیا مگر اس کا کہیں پتا نہیں۔''
جانوروں کی باتیں سن کر جنگل کا ایک بزرگ ہاتھی آگے آیا۔
وہ نہایت سمجھدار اور نرم دل تھا۔
اس نے کہا:
''دوستو! یہ درست ہے کہ لومڑی نے ہمیشہ سب کو پریشان کیا ہے، لیکن مشکل وقت میں کسی کو تنہا چھوڑ دینا اچھی بات نہیں۔''
خرگوش نے پوچھا:
''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''
ہاتھی بولا:
''اخلاقیات ہمیں سکھاتی ہیں کہ مصیبت میں دشمن کی بھی مدد کرنی چاہیے۔ ہمیں جا کر معلوم کرنا چاہیے کہ لومڑی کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔''
تمام جانور ہاتھی کی بات سے متفق ہو گئے۔
چنانچہ ایک تلاش کا دستہ تیار کیا گیا۔
خرگوش، ہرن، بندر، طوطا، مور اور چند دوسرے جانور ہاتھی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

جانور جنگل کے مختلف حصوں میں لومڑی کو ڈھونڈنے لگے۔

وہ راستوں پر گئے، جھاڑیوں کے پاس گئے، درختوں کے نیچے دیکھتے رہے۔

طوطا آسمان سے نگرانی کر رہا تھا۔

کافی دیر کی تلاش کے بعد طوطا اچانک بولا:

''ادھر آؤ! مجھے کچھ نظر آیا ہے!''

سب جانور دوڑتے ہوئے اس سمت گئے۔

وہ بیر کے درخت کے قریب پہنچے تو حیران رہ گئے۔

لومڑی زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔

اس کے پاس آدھا کھایا ہوا پیلا پھل بھی پڑا تھا۔

خرگوش گھبرا گیا۔

''ارے! یہ تو واقعی بے ہوش ہے!''

ہاتھی نے فوراً کہا:

''جلدی پانی لاؤ!''

قریب ہی ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔

بندر اور ہرن جلدی سے پانی لے آئے۔

ہاتھی نے احتیاط سے لومڑی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔

کچھ لمحوں بعد لومڑی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔

جب لومڑی کو ہوش آیا تو اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔

اس کے پاس جنگل کے وہی جانور کھڑے تھے جنھیں وہ ہمیشہ ستایا کرتی تھی۔

وہ حیران رہ گئی۔

اس کی آنکھوں میں شرمندگی آ گئی۔

اس نے کمزور آواز میں پوچھا:

''تم... سب یہاں کیوں آئے ہو؟''

خرگوش نے مسکرا کر جواب دیا:

''تمھاری خبر لینے۔''

لومڑی کو اپنی باتوں اور حرکتوں پر شدید ندامت محسوس ہوئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھی اور بولی:

''میں نے ہمیشہ تم سب کو تکلیف دی، تمھیں دھوکے دیے اور تمھیں پریشان کیا۔ لیکن آج جب میں مشکل میں تھی تو تم سب میری مدد کے لیے آ گئے۔''

وہ رونے لگی۔

''مجھے معاف کر دو۔''

پھر وہ ایک ایک جانور کے پاس گئی۔

اس نے خرگوش سے معافی مانگی۔

ہرن سے معافی مانگی۔

بندر سے معافی مانگی۔

پرندوں سے معافی مانگی۔

حتیٰ کہ اس نے ان تمام جانوروں سے بھی معافی مانگی جنھیں اس نے کبھی تنگ کیا تھا۔

جانور خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔

کچھ دیر بعد ہاتھی نے پوچھا:

''بیٹی، آخر تمھارے ساتھ ہوا کیا تھا؟''

لومڑی نے گہرا سانس لیا اور سارا واقعہ سنانا

شروع کیا۔
اس نے بتایا کہ وہ کس طرح بھوکی تھی، کس طرح اس نے پیلا پھل دیکھا، کس طرح بار بار چھلانگیں لگائیں اور آخر کار اسے حاصل کر لیا۔
پھر اس نے کہا:
''میں نے سمجھا تھا کہ یہ بہت میٹھا ہوگا، لیکن وہ تو انتہائی کڑوا نکلا۔ جیسے ہی میں نے اسے کھایا، مجھے چکر آنے لگے اور میں بے ہوش ہوگئی۔''
جانور حیرت سے سنتے رہے۔
لومڑی نے افسوس سے سر جھکا لیا۔
پھر وہ بولی:
''آج میں نے دو بڑی باتیں سیکھی ہیں۔''
''پہلی یہ کہ دوسروں کے ساتھ برائی کرنے والا آخر کار خود نقصان اٹھاتا ہے۔''
''اور دوسری یہ کہ ہر چمکنے والی چیز قیمتی نہیں ہوتی اور ہر خوبصورت نظر آنے والی چیز فائدہ مند نہیں ہوتی۔''
جانوروں نے سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔
پھر لومڑی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:
''اور ایک بات اور بھی سیکھی ہے۔''
سب نے حیرانی سے پوچھا:
''وہ کیا؟''
لومڑی بولی:
''آج کے بعد میں نے توبہ کر لی ہے کہ جو پھل بیل پر لٹکا ہوا ہو، اسے حاصل کرنے کے لیے کبھی لالچ نہیں کروں گی اور نہ ہی بغیر پہچانے کوئی پھل کھاؤں گی۔''
اس کی بات سن کر سب جانور ہنس پڑے۔
فضا میں خوشی پھیل گئی۔
اس دن کے بعد لومڑی واقعی بدل گئی۔
اب وہ کسی کو تنگ نہیں کرتی تھی۔
وہ چھوٹے جانوروں کی مدد کرتی۔
پرندوں کے گھونسلوں کی حفاظت کرتی۔
خرگوشوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی۔
اگر کسی جانور کو مشکل پیش آتی تو وہ سب سے پہلے مدد کے لیے پہنچتی۔
پہلے جو جانور اس سے نفرت کرتے تھے، اب آہستہ آہستہ اس پر اعتماد کرنے لگے۔
کچھ عرصے بعد وہ جنگل کی ایک اچھی اور ذمہ دار رہائشی بن گئی۔
ایک شام جب تمام جانور اکٹھے بیٹھے تھے تو ہاتھی نے مسکراتے ہوئے کہا:
''دیکھا! اچھائی اور محبت دلوں کو بدل سکتی ہے۔''
سب جانور خوشی سے مسکرانے لگے۔
لومڑی نے آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا۔
اس دن کے بعد جنگل میں پہلے سے زیادہ امن، محبت اور دوستی پیدا ہو گئی۔
اور سب جانور خوشی خوشی رہنے لگے۔

☆☆☆☆☆

اکیلا چاند

سنسان سڑک خاموشی کی داستان سرا بنی ہوئی تھی۔ سڑک پر لگے درخت بھی یوں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ماحول تاریکی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔اس سنسان سڑک کے کنارے بیٹھا مقبول حسین حزن وملال سے چاند کی چاندنی تکے جا رہا تھا۔ مقبول حسین قسمت کے معاملے میں خاصا غیر مقبول واقع ہوا تھا۔ قسمت نے اس سے سب چھین لیا تھا۔ بیوی بھی اور اس کی ایک ہی بیٹی تھی، وہ بھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی، جس کے قرطاس پر وہ اپنے رنج والم روشنائی کی مدد سے بکھیر رہا تھا۔ مقبول حسین کو لگتا تھا کہ دنیا میں صرف وہی اکیلا ہے لیکن آج ماحول کی حالت دیکھ کر دور فلک پر چاندنی سے ضو فشانی کرتا چاند بھی اسے اکیلا اکیلا سا لگا۔

اسی لمحے اسے اپنی بیٹی عائزہ کی ایک بات یاد آ گئی۔

"بابا! یہ چاند اتنا اکیلا کیوں ہے؟" ننھی عائزہ کا معصومانہ سوال مقبول حسین کے چہرے پر مسکراہٹ آویزاں کر گیا۔

"پاپا کی جان! چاند تنہا رہنے والوں کو ہی تنہا لگتا ہے۔ پھر چاند کے ساتھ پوری رات بھی تو ہوتی ہے"۔ اس نے جب اپنی بیٹی کو یہ جواب دیا تو وہ اس کا چہرہ پکڑ کر کسی بڑی سیانی بڑھیا کی طرح "اچھا! اچھا!" بولی تو اس وقت مقبول حسین نے ہنستے ہوئے اسے چوم لیا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس واقعے نے اس بوجھل ماحول میں بھی اس ایک فرحت بخش تازگی کا احساس دلایا۔ وہ یہ سنہرا واقعہ ڈائری کے قرطاس کی زینت بنانے لگا۔ مقبول حسین کی زندگی خوشیوں

بابر امین ابر

سے گزر رہی تھی کہ قدرت کے لکھے بھونچال نے اس کی زندگی میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک حادثے میں اس کی غم گسار بیوی اور اس جان یعنی بیٹی عائزہ کو چھین کر ہمیشہ کے لیے اس کا نصیب اماوس کی تاریک رات سا تاریک کر دیا۔ وہ اپنے ہیرے موتیوں سے واقعات ڈائری کے وسیع سینے پر پرو رہا تھا کہ اچانک اسے کسی ننھی بچے کے رونے کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ چونک اٹھا۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ جب وہ آواز والی جگہ پہنچا تو اس نے کپڑے میں لپٹا ایک ننھا سا وجود پایا۔ مقبول حسین نے اسے اٹھا لیا۔ وہ لڑکی تھی۔ اسی لمحے مقبول حسین کو لگا جیسے اس کی عائزہ پھر سے لوٹ آئی ہو۔ اس نے بے اختیار اس بچی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ بچی کو سینے سے لگائے پھر سے سڑک کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے اب آسمان کی جانب دیکھا۔ اسے چاند کے ساتھ ایک انتہائی چمکدار ستارہ نظر آیا۔ پھر اس نے بچی کی جانب دیکھا تو مسکرا دیا۔

پھر وہ ڈائری پر لکھنا شروع ہو گیا۔

"چاند کبھی بھی اکیلا نہیں ہوتا ہے۔ وہ انھیں اکیلا دکھائی دیتا ہے جنھیں اس کے اردگرد ستارے نظر نہیں آتے ہیں۔ میں بھی خود کو چاند کی مانند اکیلا ہی سمجھتا رہا۔ لیکن اب مجھے میرا ستارہ مل گیا ہے جیسا کہ ابھی اوپر آسمان میں چاند کے ساتھ اس کا ستارا موجود ہے"۔ مقبول حسین نے ڈائری پر لکھا اور ڈائری بند کر کے گلے میں لٹکے بیگ میں ڈال اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ بچی کو سینے سے لگائے سڑک پر بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اس کا ستارا مل چکا تھا۔ اب ماحول بوجھل پن کی چادر اتارے محبت اور الفت کا لباس پہنے چاند کے ساتھ مقبول حسین کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اب کوئی بھی اکیلا نہیں تھا نہ ہی چاند، نہ ہی مقبول حسین، نہ ہی سڑک، نہ ہی ماحول۔

☆☆☆☆☆

''ایک گمنام خط''

کنزیٰ خالق

یہ خط آپ سب کے نام—

جی ہاں— آپ کو بالکل بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی-- میں آپ سب سے مخاطب ہوں جو ان لفظوں کے اُس پار کھڑے ہیں-- اور اِس پار ہوں-- میں-- اور یہ لفظ جو ہمارے بیچ ہیں— یہ وہی ہیں جنھوں نے مجھے ایک عمر جکڑے رکھا یا شاید میں نے انھیں-- کہ ان کی توقیر کرنے والا کوئی دستیاب نہیں تھا--

آپ کے ذہن میں بہت سے سوال پنپ رہے ہوں گے-- تو آپ کی آسانی کے لیے میں خود ہی ان سوالوں کا جواب دیے دیتا ہوں--

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟ آپ مجھے نہیں جانتے-- اب آپ سوچیں گے کہ اگر آپ مجھے نہیں جانتے تو میرا مخاطب آپ کیوں ہیں؟ تو میرا مخاطب آپ اس لیے ہیں کیونکہ اگر آپ مجھے جانتے یا جاننے کی کوشش کرتے تو میں آج آپ کے درمیان سانس لے رہا ہوتا--

آہ— سانس لینے سے یاد آیا کہ سانس لینا

بھی کیا اذیت ہے-- جب آپ کے وجود میں پنجے گاڑھے بیٹھا عفریت ہر لمحہ آپ کی سانس کی تاروں کو الجھانے میں مصروف ہو ایسے میں ایک ایک سانس بھیک کی طرح لے کر زندگی کی گاڑی کھینچنا آسان ہے بھلا؟ ارے نہیں میں آپ کو یہ کیوں بتا رہا ہوں-- آپ نہیں سمجھیں گے--

اچھا ؟؟ آپ سمجھنا چاہتے ہیں؟ واقعی؟؟ یعنی مجھے بھی کوئی سننے والا ہے؟؟ چلیں دیر آئے درست آئے-- آپ مجھے نہیں پہچان پائے لیکن شائد-- میں— مجھ جیسے کسی کی پہچان کا وسیلہ بن سکوں— ایسے تو ایسے ہی سہی—

میں وہی ہوں جس کی پہچان ''اداکار'' ہے (نام سے فرق نہیں پڑتا حقیقت تو یہ ہے میرا کوئی نام نہیں ہے جب پہچان ہی مبہم تو نام میں کیا رکھا ہے)—

میں وہی اداکار ہوں جو فلک شگاف قہقہوں کے بیچ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ آپ سب کے سامنے موجود تھا لیکن قہقہوں کی بھیڑ میں ان آنسوؤں کو ''خوشی کے آنسو'' کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا--

میں وہی ہوں جسے دنیا ''مصور'' سمجھتی ہے-- خوشی کا مصور— جس کی تخلیقات سے جھلکتی خوشی کا مصنوعی پن کسی نے نہ دیکھا یا شائد دیکھ کر ان دیکھا کر دیا--

میں وہی ہوں جسے آپ ''کروڑ پتی'' کا لقب دے کر دنیا کے ہر غم سے مستثنیٰ خیال کرتے ہیں--

میں وہی ہوں جس کو ''کامیاب'' دیکھ کر آپ اپنی کامیابی کے اصول وضع کرتے ہیں—

ہاں!! میں اداکار ہوں کہ میرے چہرے کے پیچھے ایک کال کوٹھڑی ہے جہاں وحشتوں کی چمگادڑیں ڈیرا ڈال کر بیٹھی ہیں— ان آنکھوں کے کناروں پہ اداسی کے آسیب کا بسیرا ہے--

میں ''مصور'' ہوں جس نے اپنی تخلیق کو بنانے کے دھن میں اس کو اتنے رنگوں میں چھپا دیا کہ اس کا اصل رنگ کوئی نہیں جانتا--

میں ''شاعر'' ہوں جس کے شعروں پہ ابھرنے والی آہ کے بجائے واہ کی آواز سماعتوں پہ تازیانے برساتی ہے--

میں ''کروڑ پتی'' ہوں جس کی دولت کاغذ کے ٹکڑے ہیں— اور ان کاغذ کے ٹکڑوں کا ڈھیر بھی ایک ہمدرد کی دستیابی یقینی نہیں بنا سکتا--

میں وہ ''کامیاب'' ہوں جس کی کامیابی

رشتوں کو سنبھالنے کی کوشش میں عبرتناک شکست کے روبرو آ کر اپنے وجود پر سوال اٹھاتی ہے--

میں ''مسیحا'' ہوں جو میرے وجود کی گہرائی میں جھانک کر میرے مرض کی تشخیص کرنے والے کسی مسیحا کی آس میں دوسرے بیمار جسموں کی مسیحائی کرتے تھکنے لگا ہے--

میں اداسی کا استعارہ ہوں--

آپ نہیں جانتے سالگرہ کی تقریبات کا کیک کاٹتے چھری میرے ہاتھوں میں کیوں کانپی تھی-- یا رات کی تنہائی میں مجھے شدید پیاس کے باوجود کچن میں جانے سے خوف کیوں آتا ہے-- گیس کا سیلنڈر-- چھریاں -- چاقو -- مٹی کا تیل -- دیا سلائی-- پنکھا-- رسی-- ریل کی پٹری یہ سب چیزیں میرے ذہن میں کیا طوفان اٹھاتی ہیں--

ایک دن آئے گا جب مصروفیت کی گٹھڑی کے بوجھ تلے دبے وجود فون کی گھنٹی-- میسج کی بیپ اور نوٹیفکیشن کی دستک کے جواب میں بے ساختہ کہہ اٹھیں گے ''ارے اس نے کیوں خودکشی کی؟؟ یہ تو بہت خوش مزاج اور ہنستا کھیلتا انسان تھا . . اسے کس چیز کی کمی تھی بھلا؟؟'' یہی سوال تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ میسج کی بیپ -- اور نوٹیفکیشن کی دستک سے چند لمحے پہلے پوچھ لیے جائیں تو اس سب کی نوبت ہی نہ آئے-

میں نے بہت کوشش کی زندگی کی ڈور تھامے رکھنے کی-- تنہائی کے سمندر کی بپھری لہروں سے لڑتے میں نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے لیکن کسی کو میرے وجود کے گرد خون آشام لہریں دکھائی نہیں دیں--

''اس سے تو بات کرنا بیکار ہے اس کے موڈ کا کچھ پتہ نہیں چلتا''

''پتہ نہیں گھنٹوں کمرے میں بند کیا کرتا/کرتی ہے''

''تمھیں کیا پتہ-- ترسنا کسے کہتے ہیں؟''

''تمھیں کس چیز کی کمی ہے بھلا''

اگر آپ کے گرد ایسے یا اس سے ملتے جلتے ''القابات و اعزازت'' کا حق دار ٹھہرایا جانے والا کوئی وجود ابھی تک سانس لے رہا ہے تو-- اس کی خبر لیجیے -- کیونکہ رسی، چھریاں، دیا سلائی ہر گھر میں موجود ہے اور تنہائی کا کیا ہے وہ تو مل ہی جاتی ہے--

بس آخر میں میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ

''ڈپریشن مذاق نہیں ہے''

☆☆☆☆☆

یادوں کے قیدی

میاں خان نے ایک دفعہ پھر اپنی چارپائی سے اُٹھنے کی ادھوری سی کوشش کی اور اس دفعہ اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہو ہی گئے - دونوں ہاتھوں سے کمر کو تھامے بڑی جدوجہد کے بعد سیدھے ہو کر وہ آہستہ آہستہ سامنے دیواری الماری کے پاس پڑے ریک کی جانب بڑھے جہاں چند کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں - ذرا سا جھک کے اس نے نیلے رنگ کی ایک کتاب اٹھالی اور واپس اپنے بیڈ کے جانب آنے لگے - چارپائی کے قریب پہنچ کر بجائے اس پہ بیٹھنے کے، پاس ہی پڑی آرام کرسی میں گر سے گئے - کرسی اس کے بوجھ تلے کچھ لڑکھڑا سی گئی اور اس سے چرچراہٹ کی آوازیں بلند ہو گئیں - چرچراہٹ سے قریبی چارپائی پہ ڈھیر سادھا ماسی ہڑبڑا کر بیدار ہو گئیں - اس کی شاید ابھی ابھی ہی آنکھ لگی تھی - گردن موڑ کر اس نے میاں خان کو ناگواری سے گھورا؛ ''تم پھر اٹھ چلے نا، کتنی بار منع کیا ہے اکیلے میں یہ جوانی کے چونچلے اب ختم کر دو؛ اس عمر میں گر کر کہیں ھڈی وڈی تڑوالی تو پھر پڑے رہنا ساری زندگی چارپائی پر - میں تو نہیں سنبھالنے والی؛ اپنا بوجھ خود نہیں کھینچ سکتی اب تو ''-

''ارے نیک بخت کچھ نہیں ہوتا؛ کیا ساری زندگی اب چارپائی پہ بیٹھ کے گزار دوں - کتاب لینے اٹھا تھا''- اس نے مدھم لہجے میں جواب دیا؛

''اب کیا کرنا ہے کتابیں پڑھ پڑھ کے، ساری زندگی تو کتابوں کے بوجھ تلے گزار دی - اے لو! اور اب نظر کون سا آرہا ہے آپ کو، بس عینک ہی کو اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں ناک کے اوپر ''-

''ارے پگلی! پڑھتا کون ہے اب اس عمر میں؛ قرآن پاک کی دس بارہ سطریں ہی پڑھ لوں تو بڑی بات ہے - یوں ہی اب اتنی عادت ہو گئی ہے ان کتابوں کو دیکھنے کی، ان کی خوشبو سونگھنے اور محسوس کرنے کی؛ ناصر پشاور سے لے کر آیا تھا یہ میرے لئے، تمھیں یاد ہے نا؟'' کتاب کی جانب

نور کمال شاہ

اشارہ کرتے ہوئے میاں جی نے توضیح پیش کرنے کی کوشش کی- ناصر کے ذکر سے سادھا ماسی کی آنکھیں ایک لحظہ کو چمک اٹھیں مگر پھر فوراً ہی بجھ گئیں- کوئی جواب دیئے بغیر وہ اٹھ کر بوجھل قدموں سے دروازے تک گئیں اور اسے کھول کر پاس والی چھوٹی سی کچن میں گھس گئیں- لرزتے ہاتھوں سے چولہے کے اوپر چائے کے لیے پانی چڑھا دیا اور چینی، پتی ڈال کر فریج سے دودھ کا برتن نکالنے کو مڑیں- کام کرنے والی مائی ابھی تک کام پہ نہیں آئی تھی- دیوار پہ لگے وال کلاک پہ نظر ڈال کے اس نے سوچا- ساڑھے دس بج رہے تھے صبح کے-

''پتہ نہیں کہاں رکھی تھیں دوائیاں؟'' ساتھ ساتھ وہ کچن کے دیواری خانوں میں الٹ پلٹ کر کے اپنی دوائیاں ڈھونڈنے لگیں، ''دو تین گولیاں جب تک پھانک نہ لوں یہ جسم کا درد کم ہی نہ ہوگا، پر ہیں کہاں گولیاں؟ ابھی کل ہی تو کھا کر ڈبیاں یہاں کہیں رکھی تھیں؛ اب یہ کم بخت یاداشت بھی تو کام نہیں کر رہی''- وہ مسلسل بڑبڑاتی رہیں- دو کپ چائے بنانے میں اسے دس بارہ منٹ لگے- اس نے کمزور لرزتے ہاتھوں سے چائے دو پیالیوں میں ڈالی اور ٹرے میں رکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دوبارہ اپنے کمرے میں گھس گئیں- میاں جی کے سامنے تپائی پہ ایک کپ رکھ کر اس نے اپنا کپ تھاما اور میاں جی کے پاس ہی پڑی دوسری خالی کرسی پہ بیٹھ گئیں- ''جمیلہ نہیں آئی آج کام پہ کیا؟'' میاں جی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کے پوچھا تو سادھا ماسی نے ناگواری سے جواب دیا، ''نہیں آئی ابھی ہڈ حرام، پتہ نہیں کتنے گھروں کے کام نمٹا کر یہاں پہنچتی ہے جیسے ہم تو یہاں اس سے مفت کا کام کرا رہے ہوں''-

''نیک بخت! جب بیٹا اتنی مدت سے اپنے پاس باہر بلا رہا ہے تو چلی کیوں نہیں جاتی، کم سے کم یہ آخری عمر تو آرام سے کٹ جائے گی''- جواب جانتے ہوئے بھی اس نے مشورہ دے ہی ڈالا اور ماسی کا رٹا رٹایا جواب تیار تھا؛ ''خود کیوں نہیں چلے جاتے بیٹے کے پاس؛ بلاوے تو ہم دونوں ہی کے لیے آرہے ہیں- بڑے آئے مجھے بھجوانے والے؛ جب بیٹے کو یہ توفیق نہیں مل رہی کہ اس عمر میں آکر ہمارے پاس رہیں تو پھر ہم کیوں اس عمر میں دیار غیر میں دھکے کھاتے پھریں''-

''نیک بخت! کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ بیٹے کو اس کی اپنی مرضی کی زندگی جینے دے- ہماری زندگی اچھی بری جیسی بھی تھی ہم گذار چکے، اب تو بس موت کا ہی انتظار ہے؛ ہم کیوں بیٹے کے اس خواب کے دشمن بن جائیں جو ہم نے خود دیکھا اور اسے دکھایا تھا؛ بس دعا کرو کہ وہ جہاں رہے خوش رہے، ہاں یہ سچ ہے کہ بچے مجھے اکثر یاد آتے ہیں''-

''تو تم کیا سمجھتے ہو مجھے کوئی یاد نہیں آ رہا''؛ سادھا ماسی کے آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، ''پل پل انہیں یاد کرتی رہتی ہوں؛ بیٹے ناصر کو، نواسے نواسیوں کو؛ کتنی رونق تھی ہمارے گھر میں؛ چاروں طرف بچوں کی چہل پہل، اب تو گویا خزاں کی سی ویرانی چھائی رہتی ہے گھر میں، یہ خالی ڈھنڈار تو اب کاٹنے کو دوڑتا ہے، ترس گئی ہوں کسی کی آواز سننے کو''- سادھا ماسی نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا-

''دیکھو نیک بخت! یہ تو ہمارے لیے خوشی کا مقام ہے- ہمارا بیٹا باہر اچھی کمپنی میں منیجر ہے، ڈھیر سارا روپیہ کما رہا ہے- اسے کم از کم وہ تمام آسائشات میسر ہیں جن کے کبھی ہم خواب دیکھا کرتے تھے- میں نے اپنی محنت کی ایک ایک پائی اس پہ خرچ کی - اسے بہترین اور مہنگے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی - اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے باہر بھی بھیجا - بڑا آدمی بننا اس کی آرزو نہیں تھی بل کہ یہ تو ہمارا خواب تھا - ہم نے اپنے تمام فرائض احسن طریقے سے پورے کیے - اس کی شادی کرادی - اور بخوشی اسے ملازمت کے لیے باہر جانے کی اجازت بھی دے دی - ہم دونوں ہی پینسٹھ ستر سال سے زیادہ زندگی بسر کر چکے ہیں - میری پنشن سے بخوبی گزارا چل رہا ہے ہمارا - اب جبکہ ناصر بیٹا اپنے خاندان کے ساتھ باہر شاہانہ زندگی گزار رہا ہے تو کیا ہم اسے یہاں اپنی خدمت کے لیے آنے پر مجبور کر دیں- یہاں لا کر بٹھا دیں اسے، مجھے تو ایسا کسی طور مناسب نہیں لگ رہا - ارے پگلی! ہم اپنے حصے کی زندگی جی چکے ہیں- اب اس کی باری ہے؛ اسے اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے دیں''- خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے میاں خان نے نصیحتوں کی پوٹلی ایک بار پھر سادھا ماسی کے آگے کھول دی-

''اب ایسی بھی کیا مصروفیت، باہر ملکوں کو ہزاروں لوگ جاتے ہیں روزگار کے سلسلے میں، مگر وہ پیچھے اپنے گھر بار، اپنے والدین کو

بھول نہیں جاتے - سال چھ مہینوں بعد اپنے گھر کا چکر لگا آتے ہیں مگر ناصر اپنی جنت کی خوشیوں میں اتنا مگن ہو چکا ہے کہ اسے اب ہماری دوزخ یاد ہی نہیں آ رہی، کیا اسی لیے پال پوس کر بڑا کر دیا تھا کہ ہم اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترسیں- ہم نے تو اسے اس مقام تک پہنچانے میں اپنی زندگیاں ختم کیں- اپنی خوشیاں اپنی راحتیں اس کے نام لکھ دیں، خود تو اپنی الگ دنیا آباد کر لی اور ہمیں یادوں کے اس قبرستان میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا- یہ صلہ ہے ہماری خدمتوں کا''- ماسی بدستور منہ بسورتی رہی-

''لے، ابھی تین سال پہلے تو آیا تھا، اب اتنی دور اور اتنی مصروفیت میں ہر سال آنے سے تو وہ رہے- آ جائیں گے نا، دفتر اور روزگار کی ذمہ داریوں کے ساتھ اس کے گھریلو ذمہ داریاں بھی تو ہیں، اور اوپر سے تمھاری ضد؛ بے چارہ کیا کیا کرے آخر اور سنو! جو کچھ ہم نے اس کے لیے کیا یہ ہمارا کوئی احسان نہیں تھا بل کہ ہمارا فرض تھا- یہ سب ہم نے بدلے کے لیے نہیں کیا تھا کہ بیٹا بڑا ہو گا تو بدلے میں ہمارا احسان چکائے گا - لے اب اٹھ کے کہیں دانے پانی کا بندوبست تو کر- میں سامنے والی دکان سے سبزی لے کے آتا ہوں، پتہ نہیں جمیلہ آج کہاں رہ گئی''- کرسی کا سہارا لے کر میاں خان دھیرے سے اٹھے تو سادھا ماسی فوراً پکار اٹھیں، ''آرام سے دھیرے دھیرے جانا، پرسوں ہی ہاتھ زخمی کر کے آئے تھے پتہ نہیں یہ جمیلہ بد بخت ابھی تک آئی کیوں نہیں؟''

کمرے سے باہر مختصر سے برآمدے کے بعد صحن میں اترنے کے لیے دو تین سیڑھیاں بنی تھیں جہاں سے چھوٹا سا صحن شروع ہوتا تھا- صحن کے اردگرد کیاریاں تھیں- کیاریوں میں تازہ پھول اپنی بہار دکھلا رہے تھے- صحن کے درمیان سے باہر جانے کا راستہ نکل رہا تھا- پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر گھر کا بیرونی گیٹ تھا جو ایک کھلی وسیع گلی میں کھلتا تھا- گلی میں سے بڑی تعداد میں سکوٹر، رکشے اور کاریں گزرتی رہتی تھیں - چند قدم کے فاصلے پر اشیائے ضروریہ کی چند دکانوں سمیت ایک آدھ سبزی کی دکان بھی موجود تھی- میاں خان صحن میں اتر کر آہستہ سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھے اور اسے کھول کے باہر گلی میں نکل گئے- سادھا ماسی نے برتن اٹھائے اور کچن میں گھس گئی-

پندرہ بیس منٹ بعد گھر کا دروازہ کھلا اور دو بندے میاں خان کو سہارا دے کے اندر داخل ہوئے - سادھا ماسی اس وقت برآمدے میں بیٹھی اس ٹوٹے جگ کی کرچیاں جمع کر رہی تھیں جو ابھی ابھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گر گیا تھا -شوہر کو دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار یا اللہ خیر کی آواز نکلی اور تیزی سے صحن میں اترنے لگی-گھبراہٹ کے عالم میں دوسری سیڑھی پہ لڑکھڑا سی گئیں اور توازن یوں بگڑا کہ سیدھی نیچے کیاری میں ہی جا گریں-گلاب کی خار دار جھاڑیوں کے کانٹے اس کے ماتھے میں گھس گئے اور ہلکا ہلکا خون بھی جاری ہو گیا - میاں خان دروازے ہی سے چلائے ''نیک بخت! کیا کر رہی!!!'' اور ساتھ ہی آگے بڑھ کر ماسی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے مگر بے سود - سہارے کے لیے ساتھ آئے ایک شخص نے بھاگ کر ماسی کو اٹھایا - سادھا کی کمر میں درد کی شدید ٹھیسیں آٹھ کر پورے جسم میں پھیلتی چلی گئیں مگر اس نے اپنی تکلیف کی پرواہ نہیں کی اور میاں خان تک پہنچیں، ''کیا ہوا انہیں؟ کس نے زخمی کیا؟ ''- وہ مسلسل پوچھ رہی تھیں-

'' کچھ نہیں ہوا نیک بخت! میں بالکل ٹھیک ہوں، تم گھبراؤ نہیں''- میاں خان نے دھیرے سے جواب دیا-

'' بڑے میاں کو گلی میں رکشے نے ٹھوکر ماری ہے مگر شکر ہے یہ بچ گئے، ہڈی بچ گئی ہے بس ٹانگ پہ معمولی سا زخم آیا ہے؛ ڈاکٹر کو بلایا ہے ابھی پہنچ جائے گا - ہم نے عارضی پٹی باندھ دی ہے، بس آپ انہیں آرام سے لٹا دیں کہیں''- ایک شخص بولا اور سہارا دے کے میاں خان کو کمرے میں پہنچا دیا گیا-

ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر ماسی کے ماتھے کو صاف کیا اس پر مرہم ملنے کے بعد میاں خان کی ٹانگ کے گرد پٹی لپیٹ کے نکلا تو ظہر کی اذان کا وقت ہوا چاہتا تھا-قریبی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تو شوہر کے سرہانے بیٹھی سادھا ماسی نے فوراً اپنے سر کو اوڑھنی سے ڈھک دیا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے ''اے اللہ ہمارے ناصر کو ہمیشہ سکھی اور سلامت رکھنا اور میاں خان کی زبان سے فوراً ہی ''آمین'' نکلا!!! ''-

تیزی سے ڈھلتے سورج کی کرنیں اب اپنا رخ تبدیل کر رہی تھیں اور صحن میں کھڑے پودوں کے سائے مخالف سمت کو بڑھنے لگے تھے-

☆☆☆☆☆

خون کی سیاہی

حمزہ حسن شیخ

ہال سجایا جا چکا تھا اور تقریب میں آنے والے، ہر چہرے پر خوشی کی لہر موج زن تھی۔ اگرچہ ابھی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا لیکن محبت کے سرگم ہر سُو گونج رہے تھے اور ہر دل پر سرور طاری کر رہے تھے۔ ہال کی دیواروں کو مختلف قسم کے خوبصورت بینرز کے ساتھ سجایا گیا تھا؛ ان میں سے کچھ خوبصورت مناظر تھے، کچھ پر شادی اور محبت کے بارے میں کچھ احادیث لکھی تھیں جبکہ چند پر، زندگی کے نئے سفر کی شروعات بارے، فارسی میں کچھ اقوال بھی لکھے تھے۔ ہال کی روشنیاں ہر چہرے کو شادابی کی لہر سے چمکا رہی تھیں۔ ہال کے داخلی دروازے کو خصوصی طور پر، تر و تازہ پھولوں اور چھوٹے دمکتے ہوئے درختوں کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ موسیقی گونج رہی تھی اور اس کا ہر سُر، موسیقی کے دلدادہ لوگوں کو اس کی لے پر تھرکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہر چہرے پر خوشی کی رمق نمایاں تھی؛ جو محبت اور خوشی سے دمک رہے تھے۔ ہال میں بنا اسٹیج مختلف اقسام کے پھولوں کے

ساتھ مزین تھا جن میں سُرخ گلاب تمام پھولوں پر برتر تھے - گملوں میں لگے ہوئے مختلف پھول، سٹیج کی خوبصورتی میں، دلکش اضافہ کر رہے تھے۔ خیر و برکت کی غرض سے، کتابوں کے کچھ خانوں میں مقدس کتب رکھی گئی تھیں۔ تقریب میں آنے والے مہمانان خصوصی کے لیے کچھ صوفے سٹیج پر رکھے گئے تھے جبکہ سٹیج کے سامنے، نئی زندگی کی شروعات کرنے والے جوڑوں کے لیے، رنگین کُرسیوں کے ساتھ ایک خصوصی جگہ بنائی گئی تھی۔ اُن نشستوں کے پیچھے، مہمانوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے کرسیوں کی لمبی قطاریں لگائی گئی تھیں۔ تمام انتظامات مکمل تھے اور انتظامیہ کے لوگ، مہمان خصوصی کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئیں اور ان خالی صوفوں اور کرسیوں کو اپنی موجودگی کے ساتھ رونق بخشیں۔

یہ ایک اجتماعی شادی کی تقریب تھی جس میں سینکڑوں دولہوں اور دلہنوں کو شادی کے بندھن میں باندھا جا رہا تھا۔ تمام دولہوں اور دلہنوں نے ایک جیسے رنگ اور ڈیزائن کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ نئی زندگی کی شروعات کرنے والی اس شام کو، تمام دلہنوں کے زیورات کے ڈیزائن بھی ایک جیسے تھے۔ تمام دلہنیں اور دولہے، ایک ساتھ قطار میں، اندر داخل ہوئے تھے - تمام جوڑوں کو، ہال میں پڑے سامنے والے صوفوں پر ایک ترتیب کے ساتھ بٹھایا گیا۔ دلہن کے ساتھ دلہن، اور پھر دولہے اور پھر دو دلہنیں۔ وہ اپنی نشستوں پر براجمان ہو چکے تھے اور پھر سینکڑوں کی تعداد میں، ان تمام جوڑوں کے خاندان، دوست اور رشتہ دار ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنی نشستیں لے لی تھیں، ایک بار پھر شادی بیاہ کی روایتی موسیقی گُونجنے لگی - تمام چہرے ایک شادمانی کے ساتھ دمک رہے تھے۔ تمام لوگ ہال کی جانب بڑھ رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہ بھرتا جا رہا تھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم، ہال کے مختلف دروازوں سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ انسانی آوازوں کے شُور میں دبتے ہوئے موسیقی کے سُر، اس شور پر قابو آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم یہ سُر پھر بھی ماحول کو خوشگوار بنانے میں معاون تھے۔ دلہنوں نے علاقائی روایت کے مطابق، اپنے چہرے لمبی شال کے گھونگھٹ پیچھے چھپائے ہوئے تھے جبکہ

دولہے روایتی دولہوں کی طرح خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہ اپنی ہی شادی کی تقریب میں گفتگو کرنے سے گریزاں تھے۔ سٹیج کو سجانے والے غبارے، روشنیوں سے مختلف رنگ اُدھار لے کر، روشنی منعکس کر رہے تھے۔ اِن چمکتی دمکتی روشنیوں میں، گلدستے لوگوں کو معطر کر رہے تھے اور ماحول ان کی پُرکشش خوشبو سے مہک رہا تھا۔ تمام دولہوں نے کالے سوٹ کے ساتھ سفید قمیض زیب تن کر رکھی تھی جبکہ تمام دلہنیں سفید شالوں کے ساتھ سُرخ لباس میں ملبوس تھیں۔ ہر دل، زندگی کے نئے آنے والے لمحوں کے بارے میں پُرتعش دھڑکن کے ساتھ دھڑک رہا تھا جبکہ ہر دماغ زندگی کے آنے والے ہر موڑ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہر دلہن اس اجتماعی سماجی شادی کا حصہ بننے پر خود کو خوش قسمت تصور کر رہی تھی کیونکہ اُس کے والدین غربت کی وجہ سے کبھی بھی اُس کی شادی کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ہر دولہا اِس تقریب کا حصہ بننے پر خود کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا کہ نہ ہی وہ اپنے والدین پر بوجھ بنا تھا اور نہ ہی اپنے سُسرال پر۔ اس سادہ سی شادی کے بعد، وہ ایک ساتھ زندگی کی ساری مُشکلات کا، بغیر کسی مداخلت کے سامنا کرنے جا رہے تھے۔ ہر دماغ، اپنے ہی انداز میں ایک بھرپور اور آزاد زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ موسیقی کی تال پر روشنیاں ناچ رہی تھیں اور ہال میں موجود ہر چیز بھی خوشیوں کی اس لے میں شامل ہو گئی تھیں۔ وہ آنے والے دنوں اور راتوں کی رومانوی زندگی اور محبت کے گرم جوش لمحات کے بارے میں پُرجوش تھے۔ وہ اِس چھت تلے، ساری زندگی ایک دوسرے کو محبت کرنے کے عہد و پیماں کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ بغیر کسی مسئلے کے، اُن کی آنے والی زندگیوں کو خوبصورت بنانے کے لیے عہد اور حلف نامے کا دن تھا؛ اُن کی زندگیوں کا ایک یادگار دن، تاحیات اُن کی یادوں میں محفوظ رہنے والا دن۔ اُن کے دل مسرت سے بھرپور تھے اور ایک انجانی خوشی کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ ایک ایسی خوشی، جو کبھی بھی اُن کی یاد سے محو ہونے والی نہیں تھی اور اس نے تاحیات اُن کے ساتھ رہنا تھا۔ حسب معمول، لوگوں کا شور، موسیقی کی لے کے ساتھ سرگرداں تھا تاکہ اس کے سُر تال کو شکست

دے سکے لیکن ابھی بھی موسیقی کی تال انسانی شور پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی، جو کہ ہال میں بغیر کسی وقفے کے گونج رہی تھی۔ عورتوں کے چہرے خوب بنے سنورے تھے جبکہ مردوں کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ چھوٹے بچے اپنے روایتی ملبوسات میں بہت خوبصورت لگ رہے تھے؛ اُن کے ہنستے مسکراتے چہرے بہت جاذب نظر اور پُرکشش تھے۔ اُن کی خوبصورتی بے مثال تھی، شریر بچے یہاں وہاں کھیل کود اور چھلانگیں لگا رہے تھے جبکہ بڑے بچے مختلف ٹولیوں میں بیٹھے، اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ ننھے بچے، بھوک اور پیاس کی وجہ سے اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ اور چلا رہے تھے۔ ہال میں شور مچانے کے لیے، ہر قسم کی آوازیں بغیر کسی وقفے کے گونج رہی تھیں اور یہ موسیقی کی تال کے ساتھ محو جنگ تھیں۔ اِس چبوترے تلے، جہاں خوشیاں بانٹی جا رہی تھیں، زندگی کے مختلف زاویے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دولہے، ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جبکہ دلہنیں، سر جھکائے اور گھونگھٹ نکالے، خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ موسیقی رُک گئی اور اسٹیج پر ایک بندہ نمودار ہوا۔ اُس نے اعلان کیا کہ کچھ ہی دیر میں مہمان خصوصی کی آمد ہے اور لوگوں کا شور، تالیوں کی پُرزور گونج میں ڈوب گیا۔ شور بھنبھناہٹ میں بدلا اور جیسے ہی مقدس آیات کی تلاوت شروع ہوئی، ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ تمام لوگ مقدس آیات کو سُننے کے لیے متوجہ ہو گئے۔ تلاوت کے بعد، شہر کے سب سے بڑے خطیب نے ایک چھوٹا سا مذہبی خطبہ دیا اور پھر شہر کے میئر نے تمام جوڑوں کو، اُن کی زندگیوں میں نئے باب کی شروعات پر مبارک باد دی۔ مقدس کتاب، تمام جوڑوں کے سامنے رکھ دی گئی کہ وہ آگے آنے والی محبت بھری اور پُرسکون زندگی کے عہد کو نبھا سکیں۔ ایک انمٹ رشتے میں بندھنے کے لیے کچھ لمحات رہ گئے تھے جس کو انھوں نے زندگی کی آخری سانسوں تک نبھانا تھا اور انھوں نے اِس ہال کے چبوترے تلے اِس کی قسم کھائی تھی کہ وہ تاحیات کبھی بھی ایک دوسرے کو دغا نہیں دیں گے۔ گلدستے کے ساتھ ساتھ، تازہ پھر ایک ٹوکری، ایک خوبصورت کیک، پانی کی بوتل اور کچھ تحائف بھی ہر جوڑے کے سامنے سجے تھے

جبکہ گلدستے پر، آنے والی حیات میں برکات کے لیے مقدس کتاب بھی رکھی ہوئی تھی - شہر کے سب سے بڑے خطیب دوبارہ سٹیج پر آ گئے تا کہ وہ کچھ مقدس کلمات کی تلاوت کر کے اُن کو ایک رشتے میں پرو دیں- خوشی کے مارے، دولہوں اور دلہنوں کے دل کی دھڑکن تیز تھی- لاج سے ہر چہرہ سُرخ تھا اور گالوں پر شرم کی لالی بکھری ہوئی تھی- خوشی کے جذبات کے ساتھ کچھ جوڑوں کے ہاتھ بے قابو ہونے لگے اور وہ محبت کی نئی پناہ گاہ ڈھونڈنے کے لیے بے اختیاری سے اپنے ہمسفر کے ہاتھوں کی جانب بڑھنے لگے- پھولوں کے بیچ مقدس کتاب، ہر جوڑے کے سامنے سجی تھی اور وہ سر جھکائے، تلاوت سُن رہے تھے - تلاوت کی آواز کے ساتھ ساتھ کچھ بچے بھی رو رہے تھے- ہال میں ایک گہرا سکوت تھا کہ اچانک ایک شدید دھماکہ ہوا- بم دھماکہ اتنا خوفناک تھا کہ ہال کی چھت تک گر گئی- اب سکوت ٹوٹ گیا تھا اور پورے ماحول میں انسانی چیخیں گونج رہی تھیں- گرد اور دھوئیں کے بادلوں نے پُورے آسمان کو ڈھانپ دیا تھا- سٹیج کی ساری خوبصورتی اور سجاوٹ تہس نہس ہو چکی تھی اور جلے ہوئے پھول پتی پتی نیچے گر رہے تھے- پھولوں کی اَدھ جلی پتیاں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں- پورا منظر بھیانک تھا- اب مزید کوئی پُر کیف تلاوت یا خوشی کی تال نہیں تھی بل کہ انسانی چیخ و پکار نے پورے ماحول پر قبضہ کر لیا تھا- سٹیج یا اس کے قریب کا کوئی بھی شخص محفوظ نہیں رہا تھا- ہال کی پچھلی سمت میں موجود لوگ بہت بُری طرح زخمی ہوئے تھے- اگلی صف میں بیٹھے ہوئے دولہوں اور دلہنوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا تھا اور اُن کے اجسام کے ٹکڑے پُورے ہال میں بکھرے پڑے تھے- کچھ لمحوں کے دولہوں اور دلہنوں نے مقدس کتاب کے سامنے، اپنا راستہ اگلے جہان کی جانب سدھار لیا تھا تا کہ وہ اپنے عہد و پیمان کو وہاں پُورا کر سکیں؛ آخری وعدے جو مقدس کتاب کے جلے ہوئے اوراق پر اُن کے خون کی سیاہی سے لکھے گئے تھے- انہی جلے ہوئے مقدس اوراق پر دو کٹے ہوئے ہاتھ دھرے تھے جن کی انگلیاں اپنا عہد نبھانے کے لیے ایک دوسرے میں مضبوطی سے پیوست تھیں اور مرد و زن کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے رستا خون ان کو رنگین کر رہا تھا-

☆☆☆☆☆

”سیلن“

عمران شاہد

دوبازگشتوں سے پہلے کا ابتدائی منظر:
وہ کسی ہسپتال کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ پرانے طرزِ تعمیر کا ایک بوسیدہ کمرہ، جس کی دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ کہیں کہیں چونے کے ٹکڑے پنکھے کی ہوا سے ٹوٹ کر دیوار کے ساتھ ساتھ فرش پر گرتے اور چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی صورت جمع ہوتے جا رہے تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں صفائی کا تکلف شاید بہت عرصے بعد کیا جاتا ہوگا۔

دیواروں سے جھڑتے ہوئے چونے نے عجیب و غریب اشکال بنا دی تھیں، جیسے وقت نے اپنے بے رحم ناخنوں سے انھیں کھرچ کھرچ کر پُراسرار نقش و نگار تراش دیے ہوں۔ دیواروں کی معدوم ہوتی سفیدی ایک پرانی چادر کی مانند لگ رہی تھی، ویسی چادر جیسی کبھی گاؤں گاؤں پھرنے والے بائسکوپ والے استعمال کیا کرتے تھے، جو عوام کو فلمیں دکھانے کے ساتھ ساتھ تعلیم، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے قومی موضوعات پر پیغامات بھی پہنچاتے تھے۔

کمرے میں موجود اکلوتے بستر پر ہڈیوں کا

ایک ڈھانچا پڑا دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ اس کی مدقوق سانسوں کے ساتھ اس کا سوکھا ہوا سینہ ہلکی سی آواز کے ساتھ اوپر نیچے ہوتا، جیسے ابھی تک زندہ ہونے کی گواہی دے رہا ہو۔

اس مریض کا نام چودھری حشمت علی تھا۔

اس کا دایاں ہاتھ بے جان پڑا تھا اور دایاں پاؤں بھی مفلوج تھا۔ وہی ہاتھ جس کی ایک جال ساز جنبش اسے کئی ایکڑ زمینوں کا مالک بنا دیا کرتی تھی۔ وہی ہاتھ جس کے ایک دستخط سے کئی خاندان بے گھر ہو کر اُجڑ گئے تھے۔

مگر آج اس ہاتھ سے ایک مکھی تک نہیں اُڑائی جاتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں زخمی درندے جیسے بھیانک تاثرات پوشیدہ تھے۔ وہ شکل اور انداز سے ایسا بھیڑیا لگتا تھا جو عمر رسیدہ ہو جانے کے باعث کسی کو گزند تو نہیں پہنچا سکتا، مگر اس کی زخمی اور شاکی نظریں ماضی کی تمام خون آشام وارداتوں کی خاموش داستان اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔

چودھری صاحب کی پوری کائنات اب یہی دم گھونٹ دینے والا کمرہ تھا، جس کی چھت پر لگا پنکھا اپنی ہی دھن میں گھومتا رہتا، اور وہ اس پر بے مقصد نظریں جمائے دن رات اس کی غوں غوں کی میکانکی آواز سنتا رہتا تھا۔

کمرے کے باہر وارڈ میں قدموں کی چاپ سنائی دی تو ان قدموں کے ساتھ ہی وہ سوال بھی پھن اُٹھا کر ان کے من کے اندر کھڑا ہو گیا، جس کی بازگشت اس کے اس جنم میں بھی ختم نہ ہوئی تھی:

''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

بازگشتِ اول (چودھری حشمت علی)

یہ جملہ میں نے پہلی بار اس وقت سنا تھا جب میں پہلی مرتبہ سکول جانے لگا تھا۔

میں ابا کے بیڈ روم کے باہر برآمدے میں یونیفارم پہنے کھڑا تھا۔ چمچماتے جوتے، جن میں میرا چہرہ منعکس ہو رہا تھا، اور کاندھے پر کتابوں سے بھرا بستہ۔ میرے سخت گیر باپ نے میری ماں کی طرف خون آشام نظروں سے دیکھ کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا تھا:

''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

باپ نے جس لہجے میں سوال کیا تھا، وہ سوال نہیں بل کہ ایک ایسا تازیانہ تھا جو بغیر ہاتھ اٹھائے ماں کی روح پر برسایا گیا تھا۔

ماں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی: سر نیہواڑے، کندھے سکیڑے، ہونٹ کاٹتی ہوئی، آنسو ضبط کرتی ہوئی۔

میں نے اسی دن زندگی کی تنگ دہلیز کے اندھیروں میں یہ جان لیا تھا کہ خاموشی بھی

بعض اوقات اعتراف بن جایا کرتی ہے۔

شک وراثت بن جاتا ہے، ایسی وراثت جو بغیر کاغذ، بغیر گواہ، نسل در نسل رگوں میں اندھیرا بن کر چلتی رہتی ہے اور انسان کی روح کو مرتے دم تک کچوکے دیتی ہے۔

ایک نسل سے دوسری نسل تک، پشت در پشت، جینز کی گتھیوں میں زہر منتقل کرتی رہتی ہے۔

میں ان اندھیروں سے ڈر کر بھاگ نکلا تھا۔

پہلے پٹوار خانے میں پناہ لی، پھر کچہری پہنچا، اور آخر کار جرائم کی اس دنیا میں اس مقام تک جا پہنچا جہاں قلم کی ایک جنبش سے زمینوں کے پشتینی مالک بدل جاتے، لوگ بھیک مانگنے کے لیے فٹ پاتھوں پر جا پہنچتے، اور میں ان کی جائیداد کو پکے ہوئے پھل کی طرح ہڑپ کر جاتا۔

میں غربت سے تو بچ نکلا تھا، مگر غربت میں سنے ہوئے چند جملے میرے ساتھ ساتھ ہی چلتے رہے، بل کہ عمر بھر میرا پیچھا کرتے رہے:

''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

بازگشتِ دوم (صباحشمت)

میرا شوہر چودھری حشمت علی میرے سامنے بستر پر پڑا تھا، بے جان، زندگی کا ٹھکرایا ہوا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو اپنے سامنے کسی کو دم مارنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔

تحکم اور خود پسندی اس کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جن سے لوگ اسے پہچانتے تھے۔ بل کہ یہی اوصاف اسے دوسروں سے ممتاز بھی کرتے تھے۔

میں پہلی مرتبہ جب اس کے دفتر میں داخل ہوئی تھی تو اس کی دہشت سے میری گھگی بندھ گئی تھی۔ میرا گلا یوں خشک ہو گیا تھا جیسے میں ملازمت کے انٹرویو کے لیے نہیں بل کہ سزائے موت کے قیدی کی طرح پھانسی کے تختے پر لٹکانے کے لیے لائی گئی ہوں۔

تعارف کے دوران جب میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی تو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ بڑے بڑے، بھاری بھرکم ہاتھ، سونے کی انگوٹھیوں سے بھرے ہوئے۔

کلائی پر ہیرے جڑی سنہری گھڑی، اور شہادت کی انگلی پر گُدا ہوا ایک چھوٹا سا چاند ستارہ، جو نہ جانے کس بات کی علامت تھا۔

وہ شکل سے ہی ایک جابر اور خود غرض انسان معلوم ہوتا تھا، جس کی زندگی کا محور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا تھا۔

اس جیسے واجبی پڑھے لکھے مگر زیرِ زمین تنظیموں اور سرکاری دفاتر میں سرگرم رشوت خور مافیا سے جڑے ہوئے، بظاہر سیاست

میں متحرک آدمی کے لیے کمزور طبقے کے لوگوں کا قیمتی زمینوں پر قبضہ کرنا، انھیں اپنے نام منتقل کروانا، خود بھی عیش کرنا اور دوسروں کو بھی مزے کروانا محض کاروبار نہیں بل کہ ایک دلچسپ مشغلہ بھی تھا۔

اس کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال اس قدر گہرے تھے کہ بظاہر ناقابلِ شکست محسوس ہوتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر کئی لوگ اپنی زندگیاں اور زمینیں ہار جایا کرتے تھے۔

ابا کی پانچ ایکڑ زمین بھی اسی ظالم شخص نے چھینی تھی۔

ابا اس کی سازشوں کا شکار ہو کر مفلوج ہو گئے تھے، اور ان کے وہی ہاتھ جو کبھی بسنت کے دنوں میں پتنگیں اڑایا کرتے تھے، اب اس حال کو پہنچ چکے تھے کہ اپنی ناک پر بیٹھی ایک مکھی تک نہیں اڑا سکتے تھے۔

جائیداد کے پرانے خاندانی کاغذات اور نقشے اب بھی میرے پاس محفوظ تھے، مگر اس کی ملکیت چودھری حشمت علی کے فرنٹ مین کے نام منتقل ہو چکی تھی۔

باپ دادا کی نسلوں کی محنت سے کمائی ہوئی پشتنی زمین اور حویلی، بندوق کی نوک پر لیے گئے چند دستخطوں کے عوض ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

یہ ایک ایسا گہرا گھاؤ تھا جس سے سنبھلنا ابا جیسے مضبوط آدمی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔

شاید وہ جائیداد کے جانے سے کہیں زیادہ اپنی بے بسی پر دل برداشتہ تھے، کیونکہ قانون اور ادارے سب اسی ظالم کی انگلیوں پر رقص کرتے تھے۔

ابا کی تمام درخواستیں اور شکایات انھی چھوٹے افسروں کے پاس انکوائری کے لیے واپس پہنچ جاتی تھیں، جن کی شامیں چودھری صاحب کی عشرت گاہ میں دادِ عیش دیتے گزرتی تھیں۔

تمام انکوائریاں یا تو خاموش رہتیں یا پھر ان کی وفات تک کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں، کیونکہ افسروں کو اپنا آج زیادہ عزیز تھا، اس لیے وہ ڈٹ کر چودھری کا ساتھ دیتے رہے۔

سسٹم کا مارا ہوا انسان کہیں بھی سکون نہیں پا سکتا، سوائے قبر کے۔

اور یہی میرے مظلوم ابا کا مقدر ٹھہرا۔

ابا کی وفات کے بعد مجھے خود اپنے حق کے لیے لڑنا پڑا، جب کہ امی کی دیکھ بھال کا بوجھ ایک اولڈ ہوم کے سپرد کرنا پڑا، جسے آج پورے پندرہ برس بیت چکے تھے۔

میں دل میں شعلے اور آنکھوں میں عزم لیے، خالی ہاتھ زندگی سے اپنا حق وصول کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

جب بھی میں مہینے کے اوائل میں امی سے ملنے اولڈ ہوم جاتی تو میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھتیں:
''میں یہاں سے کب جاؤں گی، بیٹی؟''
یہ سنتے ہی میرا سر جھک جاتا، کیونکہ میری بے بسی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی۔
میں مجبوراً یہی جواب دیتی:
''ابھی نہیں، امی..... ابھی وقت نہیں آیا۔''
اور امی بھولپن سے میری بات مان لیتیں، پھر اپنا آنسوؤں سے تر دوپٹہ رب کے حضور پھیلا کر دعا مانگنے لگتیں کہ جلد انھیں اس ہسپتال جیسے اداس اور گھٹن بھرے ماحول سے نجات نصیب ہو جائے۔
مگر اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے۔
معروضی حالات تیزی سے بدل رہے تھے، اور انھی بدلتے ہوئے حالات نے میرے اندر یہ امید جگائی تھی کہ برسوں سے بندھے ہوئے بند اب ٹوٹنے والے ہیں۔
مجھے شدت سے ایسا محسوس ہو رہا تھا، اور میرے دل نے آج تک کبھی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔

بازگشتِ اول (چودھری حشمت علی)

میری پہلی بیگم بلقیس بہت وفادار عورت تھی۔
اس کی پاک دامنی کی سب قسم کھاتے تھے اور مجھ پر رشک بھی کرتے تھے کہ مجھ جیسے دنیا دار شخص کے نصیب میں ایسی پاک باز عورت کا ساتھ لکھا گیا تھا۔
اس نے ایک عمر مجھ جیسے گنہگار آدمی کے ساتھ گزار دی، مگر اس کے لبوں پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔
وہ غربت میں بھی ساتھ رہی، دولت آئی تو میرا غرور سہتی رہی۔ اولاد نہ ہوئی تو خاموش رہی۔ دنیا کے سامنے بھی، اور میرے سامنے بھی۔
وہ اپنی کیاریوں کے پودوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ شاید وہاں سے اسے وہ سکون مل جاتا تھا جو میرے پاس نہیں تھا۔
مجھے احساس تھا کہ میں اس کا حق ادا نہیں کر رہا، میرا مزاج ایسا نہیں تھا کہ دوسروں کے حقوق کے بارے میں سوچتا۔
میں اپنی مستی میں گم رہا اور بلقیس موم بتی کی طرح اپنے ہی شعلے میں پگھلتی رہی۔
میں اسے وہ عزت نہ دے سکا جس کی وہ حق دار تھی۔
آخر وہ میری شریکِ حیات تھی اور میں ایک منتکبر زمیندار گھرانے کا وارث۔
تاہم اولاد کی کمی نے اسے اندر سے کمزور کر دیا تھا۔
جیسے تیسے کر کے وہ زندگی کے دن گن رہی تھی۔ یہاں اسے عزت کے علاوہ سب

کچھ حاصل تھا، سو وہ سر جھکائے وقت گزار رہی تھی۔

پھر صبا میری زندگی میں بہار کے ایک جھونکے کی مانند داخل ہوئی۔

ایک ملازمت کے انٹرویو کے دوران۔

ایک نظر کے ذریعے، جو میں نے عینک کے اوپر سے اس پر ڈالی تھی، اور جس میں میں اسے روزگار دینے کے بجائے دل دے بیٹھا۔

میں نے دوسری شادی کا فیصلہ اولاد نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کیا۔

ہم مردوں کے پاس اولاد نہ ہونے کا بہانہ ایسا تیرِ بہدف نسخہ ہوتا ہے کہ عورت کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔

چنانچہ بلقیس نے ایک لفظ نہ کہا، بس خاموشی سے گھر چھوڑ گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اس نے میرے گھر سے کوئی ساز و سامان نہیں اٹھایا۔ فقط تن کے کپڑوں، چند پرانے جوڑوں اور ایک شال کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

وہ ایسی خاموشی سے میری زندگی سے نکلی کہ کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔

اس کا ہونا یا نہ ہونا میرے لیے برابر ہو چکا تھا۔

ہم دونوں وقت کے ساتھ صرف نام کے میاں بیوی رہ گئے تھے۔

نہ اس میں وہ حسن اور جوانی باقی رہی تھی جن کا میں کبھی دیوانہ تھا، اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی دلچسپی باقی رہی تھی، خاص طور پر جب اس کے ٹیسٹوں سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔

تب سے ہم دونوں نے اپنے درمیان ایک اَن دیکھی لکیر کھینچ کر اپنی اپنی زندگی جینا شروع کر دی تھی۔

میری زندگی میں خوشیوں اور رونقوں کی حرارت تھی، جبکہ اس نے عبادات، خیرات اور نباتات کی پُرسکون مگر سرد مہر زندگی چن لی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کبھی خاص خبر نہ لی۔

البتہ منشی نے کہیں سے معلوم کر لیا تھا کہ بلقیس اپنی بڑی بہن کے پاس کوہاٹ چلی گئی ہے۔

دونوں بہنیں گھر میں بیکری کا سامان تیار کرتیں اور اسی کو بیچ کر گزارا کرتیں۔

میں نے اس کاروبار کے بارے میں سن کر قہقہہ لگایا تھا۔

پھر مڑ کر کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ کس حال میں تھی۔

چند مہینوں بعد تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میری ایک بیوی پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔

میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔
میرے پاس نہ تو بلقیس جیسے ناکام لوگوں کے لیے وقت تھا اور نہ ہی دلچسپی۔
میں صبا کے ساتھ ایک نئی دنیا بسا رہا تھا۔
بلقیس کے ہوتے ہوئے حویلی ایک سنسان جگہ معلوم ہوتی تھی، جہاں دن کے وقت بھی وحشت برستی۔
صبا آئی تو یوں لگا جیسے حویلی میں زندگی واپس آ گئی ہو۔
اس کے نوجوان قہقہوں نے ہر طرف خوشیوں کے رنگ بکھیر دیئے۔
ملازم بھی خوش تھے، کیونکہ بڑی بیگم کے ہوتے ہوئے وہ بھی دبکے دبکے رہتے تھے، مگر اب سب مالکوں کی خوشیوں میں شریک دکھائی دیتے تھے۔
زندگی ایک لگے بندھے راستے پر چل رہی تھی کہ اچانک حالات نے ایک نیا موڑ لیا۔
صبا نے خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔
مجھے خوش ہونا چاہیے تھا، مگر میں خوش نہ ہو سکا۔
میرے اندر ایک خاموش اندھیرا جاگ اٹھا تھا۔
شک کے ناگ نے پھنکار کر انگڑائی لی۔
وہی اندھیرا، جہاں تنگ دلیز کے پیچھے بیٹھ ایک بچہ آج بھی اپنے باپ کی آواز سن رہا تھا:
''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

بازگشتِ دوم (صبا حشمت)

''والد کیا کرتے ہیں؟''
چودھری حشمت علی نے انٹرویو کے دوران مجھ سے پوچھا تھا۔
میں ایک لمحے کے لیے رکی تھی، جیسے آدمی کوئی سچ بولنے سے پہلے رکتا ہے۔
''والد اب اس دنیا میں نہیں رہے، سر''
آنکھ کے ایک کونے سے آنسو بھرا تھا اور میں نے اسے گرنے دیا تھا۔
بعض اوقات آنسو وہ کام کر جاتے ہیں جو الفاظ نہیں کر پاتے۔
چودھری حشمت کے چہرے پر ایک ایسا تاثر ابھرا تھا جسے شاید وہ ہمدردی سمجھ رہا تھا، مگر میں جانتی تھی کہ وہ ہمدردی نہیں تھی۔
وہ طاقت اور برتری کا وہ نشہ آور احساس تھا جو بعض اوقات کسی کمزور انسان کو اپنے سامنے بے بس دیکھ کر طاقتوروں کے اندر جاگ اٹھتا ہے۔
طاقتور لوگ اکثر اپنی اسی کمزوری کو انسانیت کی تڑپ سمجھ بیٹھتے ہیں، حالاں کہ حقیقت اس سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔

بازگشتِ اول (چودھری حشمت علی)

''بتا..... کس کا بچہ ہے تمھارے پیٹ میں ہیں؟''
میں نے پہلی بار یہ سوال کیا تو صبا کے چہرے پر ایک ایسا رنگ ابھرا جسے میں سمجھ نہ سکا۔

مگر وہ خاموش رہی۔
بالکل ویسے ہی جیسے میری ماں خاموش رہا کرتی تھی، سر جھکائے، بے آواز، جیسے کوئی انجانا اعتراف اپنے اندر دفن کر رہی ہو۔
صبا کی خاموشی مجھے جلاتی بھی تھی اور خوف زدہ بھی کرتی تھی۔
میرے اندر جیسے جھنجھناہٹ سی بھر گئی تھی۔
دل و دماغ میں عجیب وسوسے اُٹھتے رہتے تھے۔
مجھے ان وسوسوں کی کوئی ٹھوس وجہ معلوم نہ تھی، مگر میرا دل مسلسل ڈوبتا جا رہا تھا۔
آخر ایک دن میں نے کھانا کھاتے ہوئے اسے کہہ ہی دیا:
''ڈی این اے ٹیسٹ کروانا ہوگا۔''
اس نے زخمی نظروں سے میری طرف دیکھا، مگر خاموش رہی۔
اس نے نہ احتجاج کیا، نہ بحث کی، نہ کوئی صفائی پیش کی۔
صرف اتنا کہا:
''ٹھیک ہے۔''
اور خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
مگر اس کی وہ بظاہر آسان سی رضامندی میرے اندر اژدھے کی طرح پھن پھیلائے بیٹھ گئی تھی۔
میں رپورٹ کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔
ذہن پر ایک عجیب سی وحشت طاری تھی۔
جس دن رپورٹ موصول ہوئی، میں دفتر میں کام کرتے ہوئے اچانک فرش پر گر پڑا۔
سٹاف والے مجھے جلدی سے قریبی نجی ہسپتال لے گئے، مگر اس کے بعد میں کبھی اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکا۔
نہ میری صحت پہلے جیسی ہو سکی۔
فالج نے میرے جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔
دایاں ہاتھ اور ٹانگ موجود تھے مگر بے کار، زبان سلامت تھی مگر بے آواز۔
میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے ایک ایسے مجسمے میں تبدیل ہو گیا تھا، جس میں نہ حرکت باقی رہی تھی اور نہ آواز۔
صبا روز کمرے میں آتی، دوا دیتی، کھانا رکھتی۔
میں اشاروں میں صرف ایک ہی سوال پوچھتا:
''رپورٹ؟''
اور وہ بغیر جواب دیئے خاموشی سے باہر نکل جاتی۔
اس کی یہی پراسرار خاموشی مجھے اندر ہی اندر ڈستی رہتی۔
رات کو مجھے اپنے باپ کو آواز سنائی دینے لگتی:
''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

بازگشتِ دوم (صبا حشمت)

دن گزر رہے تھے، مگر خاموشی سے نہیں۔

بہت کچھ بدل رہا تھا۔

میں دیکھ رہی تھی کہ چودھری حشمت علی اندر ہی اندر جل رہا ہے۔ یہ ویسی ہی آگ تھی جس نے میرے ابا کو جلا ڈالا تھا۔

وہ ہر اس دن جلے تھے جب وہ کچہری کے باہر کھڑے رہتے اور چودھری حشمت علی کالے شیشوں والی لمبی گاڑی میں دھول اڑاتا ان کے سامنے سے گزر جاتا، مگر اسے کبھی توفیق نہ ہوتی کہ کم از کم ان کی بات ہی سن لیتا، کیونکہ اس کے دل میں چور تھا۔

طاقت اور تعلقات کے زور پر اس نے نہ صرف ہماری زمینوں پر قبضہ کیا تھا بل کہ انھیں زبردستی اپنے نام بھی منتقل کروالیا تھا۔

اتنی قیمتی جائیداد کے بدلے ہمیں پھوٹی کوڑی تک نصیب نہ ہوئی۔

ابا قبرستان پہنچ گئے اور ماں لاوارث بوڑھوں کے خیراتی ادارے میں، مگر بڑے بڑے ناموں والے دفاتر کے بند کمروں میں بیٹھے سوٹڈ بوٹڈ افسروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

میں نے تبھی فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنا حق خود حاصل کرنا ہوگا۔

پھر ایک دن میں نے چودھری حشمت سے کہا:

''ایک نئے ہسپتال کا پتا چلا ہے۔ فالج کے مریضوں کے لیے خاص ہسپتال ہے۔ آپ چلیں گے؟''

اس کی ویران آنکھوں میں التجا تھی۔

وہی آنکھیں جن میں کبھی غرور کی چمک ہوا کرتی تھی۔

اس نے خاموشی سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

بازگشتِ اول (چودھری حشمت علی)

گاڑی اجنبی راستوں پر رواں تھی۔

پہلے شہر ختم ہوا، پھر ٹریفک کا شور، پھر آبادیاں معدوم ہوئیں اور آخرکار صرف کھیتوں کی خاموشی باقی رہ گئی۔

میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز پڑا سوچتا رہا:

''کون سا ہسپتال اتنی دور ہوسکتا ہے؟ یہ عورت آخر مجھے کہاں لے جارہی ہے؟''

اسی میں اتنی جرأت تو نہ تھی کہ مجھے کوئی جانی نقصان پہنچاتی، مگر پھر بھی کسی پر بھروسا تو نہیں کیا جاسکتا۔

زمانہ اعتبار کے قابل نہیں رہا۔

اور پھر عورت ذات.....

میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سوچا۔

ماضی میں میرے قریب رہنے والی درجنوں عورتوں کے نام اور چہرے ذہن میں ابھرے اور پھر دھندلا گئے۔

میں نے کبھی کسی پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

البتہ صبا میری پسندیدہ عورت تھی، اور پھر میری بیوی بھی۔

صبا خاموشی سے گاڑی چلا رہی تھی۔
اس کے ساتھ ایک اجنبی نوجوان بھی بیٹھا تھا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔
میں اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، مگر پوچھ نہیں سکتا تھا، اور نہ ہی صبا نے تعارف کروانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔
میں بے بسی سے اسے گاڑی چلاتے دیکھتا رہا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی رہی۔

بازگشتِ دوم (صبا حشمت)

تین گھنٹوں کی طویل ڈرائیو کے بعد ہم ایک پرانی سفید عمارت کے سامنے جا رکے، جس کے اندر ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔
سفید بال، جھریوں سے بھرے چہرے، تھکی ہوئی مایوس آنکھیں اور خاموش راہداریاں۔
میں نے اسے وہیل چیئر پر بٹھایا اور عمارت کے اندر لے گئی۔
وہ گردن گھما گھما کر ہر طرف دیکھتا جا رہا تھا۔
کئی راہداریاں عبور کرنے کے بعد ہم اس مانوس کمرے کے سامنے جا رکے جسے میں پندرہ برس سے بخوبی پہچانتی تھی۔
میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔
امی بستر پر لیٹی تھیں۔
کمزور اور تھکی ہوئی آنکھیں، سفید بال، اور وہی سوکھے ہوئے ہاتھ جو برسوں سے صرف دعا کے لیے اُٹھتے رہے تھے۔
انھوں نے مجھے دیکھا تو اُٹھ بیٹھیں۔
پھر حیرت سے وہیل چیئر پر بیٹھے چودھری حشمت کو غور سے دیکھا، مگر شاید اس کسمپرسی کے عالم میں اسے پہچان نہ سکیں۔
وہ خوش ہو کر بولیں:
''آ گئیں صبا بیٹی؟ اس بار اتنے دن کیوں لگا دیئے آنے میں؟''
میں نے پیار سے ان کا ہاتھ تھاما اور ان کے کاندھے پر اپنا چہرہ رکھ کر دھیرے سے کہا:
''بس امی..... آج کے بعد آپ کو انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ آج یہاں آپ کا آخری دن ہے۔ مشکل وقت ٹل گیا ہے۔''

بازگشتِ اول (چودھری حشمت علی)

یہ بڑھیا کون ہو سکتی ہے؟
میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس عورت کو دیکھا۔
صبا جس اپنائیت اور محبت سے اس کے ساتھ پیش آ رہی تھی، اس سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ اس کی ماں ہے۔
مگر صبا نے تو مجھے کبھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔
میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ صبا میری طرف مڑی۔
اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سرد مہری تھی،

جیسے برسوں سے دبی ہوئی برف آج چنگاری بن کر شعلے کی صورت اختیار کر گئی ہو۔

''زیادہ حیران مت ہوں، چودھری صاحب، یہ میری امی ہیں۔ پندرہ برس سے یہی کمرہ ان کی پوری کائنات ہے۔ جب سے ابا دنیا سے گئے..... جب سے گھر بار، زمینیں، عزت و آبرو..... سب کچھ چلا گیا''

وہ چند لمحے خاموش رہی۔

پھر اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیرے مگر واضح لہجے میں کہا:

''اور جانتے ہیں میں کون ہوں؟ میں ملک اسلم کی بیٹی ہوں۔ وہی ملک اسلم، جس کی زمین آپ کے گماشتوں نے ان کے سر پر بندوق رکھ کر، ڈرا دھکا کر، زبردستی دستخط کروائے اور آپ کے فرنٹ مین کے نام منتقل کر دی تھی۔''

''وہ برسوں آپ کے دفتر اور کچہری کے چکر لگاتے رہے، مگر آپ نے کبھی ان سے ملنے کی زحمت تک نہ کی۔ جائیداد کا چھن جانا تو ایک طرف، مگر اس کے بعد جو بے بسی اور ذلت انھوں نے دیکھی، وہ اسے برداشت نہ کر سکے..... اور ایک دن ہمیں لاوارث چھوڑ کر چلے گئے۔''

اس کے الفاظ کمرے کی سیلن زدہ دیواروں میں جذب ہوتے چلے گئے۔

میں ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

میری زبان بے جان تھی، مگر شاید سلامت بھی ہوتی تو اس وقت میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

پھر وہ آہستہ سے بولی:

''آج سے یہی آپ کا کمرہ ہے۔ امی کا امتحان ختم..... اور آپ کا شروع۔''

(دو بازگشتوں کے بعد کا آخری منظر)

صبا اپنی امی کا ہاتھ تھامے دروازے تک آئی، پھر ایک لمحے کے لیے پلٹی۔

چودھری حشمت وہیل چیئر پر ہکا بکا بیٹھا اسے تک رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ایسا نامعلوم خوف تیر رہا تھا جو شاید اس نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ خوف جو طاقت چھن جانے کے بعد انسان کے اندر جنم لیتا ہے۔

کمزوری اور بے بسی کا ایک ایسا مرکب احساس، جو طاقتور کے منہ کا ذائقہ بگاڑ دیتا ہے۔

صبا نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکالا۔

پھر آہستگی سے لفافہ کھول کر ایک کاغذ حشمت کے سامنے رکھ دیا

''آپ کو ڈی این اے رپورٹ چاہیے تھی نا؟ یہ لیجیے۔''

حشمت کی لرزتی ہوئی نظریں کاغذ پر جم کر رہ گئیں۔

DNA Match Result: Probability of Parernity0%

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں پتھر کی ہو کر رہ گئیں۔

جیسے وقت اچانک تھم گیا ہو۔

صبا نے دھیرے سے کہا:

''آپ کا شک درست تھا، چودھری صاحب، یہ بچہ واقعی آپ کا نہیں۔''

پھر وہ چند لمحے خاموش رہی اور نہایت سپاٹ لہجے میں بولی:

''مگر میں آپ سے بے وفائی کا مرتکب بھی نہیں ہوئی۔ جس شخص سے میں محبت کرتی ہوں، یہ بچہ اسی کی امانت ہے۔ سروگیسی کا نام تو سنا ہوگا آپ نے۔''

وہ صبا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

اس کی آنکھوں میں اب صرف حیرت ہی نہیں تھی بل کہ شکست، ذلت، خوف اور برسوں کے جمع شدہ شک کی راکھ تیر رہی تھی۔

صبا مڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پھر دروازے پر رک کر غالباً آخری بار اس کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی:

''یہ کمرہ اور یہ نئی زندگی آپ کو مبارک ہو، چودھری صاحب۔ میری بے قصور امی نے پندرہ برس یہاں سے نکلنے کی آس میں گزار دیئے..... اب آپ کی باری ہے۔ دیکھیے، آپ کی تقصیر کب معاف ہوتی ہے۔''

وہ اپنی امی کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

راہداری میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

دور کہیں کسی مریض کی بلغم زدہ کھانسی کی آواز ابھری، او پھر چند لمحوں بعد راہداری دوبارہ خاموشی میں ڈوب گئی۔

کمرے میں سیلن کی بو اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔

پنکھا اب بھی اسے بے حسی سے گھوم رہا تھا اور اس کی غوں غوں کمرے میں گونج رہی تھی۔

دیواروں سے پلستر اب بھی جھڑ کر سفیدی کے پس منظر میں ناقابلِ فہم نقوش بنا رہا تھا۔

چودھری حشمت علی کے سامنے وہی ڈی این اے رپورٹ پڑی تھی جس کا اسے شدت سے انتظار تھا، جس کی راہ تکتے تکتے اس کی نگاہیں پتھرا گئی تھیں۔ مگر اب اس کمرے میں صرف ایک ہی جملہ گونج رہا تھا:

''بول..... کس کا بچہ ہے یہ؟''

☆☆☆☆☆

کوئٹہ کیفے میں انتظار کرتی لڑکی

اسلام آباد غروب آفتاب کے وقت ہمیشہ کچھ مختلف محسوس ہوتا تھا۔

اس شام آسمان سنہری اور سرمئی رنگوں کے درمیان معلق تھا، گویا شہر خود فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رات کا استقبال کرے یا اسے روکنے کی کوشش کرے۔

میں اپنی پرانی سی ڈی 70 موٹر سائیکل پر شہر کے مضافات کی ایک سنسان سڑک سے گزر رہا تھا، جہاں درختوں اور ناہموار زمین کے درمیان ایک چھوٹی سی پارکنگ چھپی ہوئی تھی۔ وہ جگہ بھولی بسری محسوس ہوتی تھی، چاروں طرف پھیلا ہوا ہلکا سا جنگل آوازوں اور روشنی کو اپنے اندر نگل لیتا تھا۔

میں اسلام آباد میں بطور پیئنگ گیسٹ رہنے والا آئی ٹی کا طالب علم تھا، اور کلاسوں کے بعد اکثر بے مقصد گھومنے نکل جاتا تھا۔

تنہائی اب میری عادت بن چکی تھی۔

جیسے ہی میں پارکنگ میں داخل ہوا، میری نظر اپنے سے کچھ فاصلے پر ایک اور موٹر سائیکل پر پڑی۔

ایک لڑکی۔

اس کی سی ڈی 70 ناہموار زمین پر پھسل گئی اور وہ سوکھے پتوں کے ایک ڈھیر کے قریب جا گری۔ چند لمحوں تک وہ بے حرکت رہی، پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں فوراً اس کی طرف بڑھا۔

”کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا۔

ڈوبتے سورج کی مدھم روشنی درختوں کی شاخوں سے چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی رنگت میں شام کی نمایاں حدت تھی؛ نہ بہت گوری، نہ سانولی، بل کہ بارش کے بعد بھیگی ہوئی زمین جیسا دلکش رنگ۔

اس کے سیدھے، ریشمی بال چہرے کے گرد بکھرے ہوئے تھے اور شام کی ہلکی ہوا کے ساتھ آہستہ آہستہ لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا، ایسا گہرا سکون جو اس کی عمر سے کہیں زیادہ محسوس ہوتا تھا۔

اس کی خوبصورتی میں کچھ غیر معمولی تھا۔

وہ خوبصورتی نہیں جو فوراً توجہ مانگے، بل کہ وہ جو خاموشی سے دل و دماغ پر نقش ہو جائے۔

اذان خالد

ایسی خوب صورتی، جو نگاہ ہٹانے کے بعد بھی ذہن سے نہ جائے۔

اس کے بازو پر چند خراشیں آ گئی تھیں۔

ہمارے پیچھے ایک چھوٹا سا پلازہ تھا۔ نیچے روشن ''کوئٹہ کیفے'' تھا اور اوپر سلائی کڑھائی کا تربیتی مرکز۔ اس کے بیگ سے لٹکتی ہوئی پیائش کی ٹیپ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ وہاں کلاس لینے آتی ہو۔

میں نے کہا، ''آپ کو یہ زخم صاف کر لینے چاہئیں۔''

وہ ہلکے سے مسکرائی۔

وہ مسکراہٹ کچھ عجیب سی تھی۔

جیسے وہ پہلے ہی کوئی ایسی بات جانتی ہو، جس سے میں ابھی بے خبر تھا۔

میں نے کہا، ''آپ کیفے میں میرا انتظار کریں، میں میڈیکل پلاسٹ لے کر آتا ہوں۔''

اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

قریب ترین میڈیکل سٹور چند منٹ کی مسافت پر، درختوں سے آگے ایک چھوٹی سی آبادی کے پاس تھا۔ میں جلدی سے وہاں گیا، پٹیاں خریدیں اور واپس روانہ ہو گیا۔

مگر نہ جانے کیوں، پورا راستہ معمول سے زیادہ طویل محسوس ہو رہا تھا۔

سڑک اجنبی لگ رہی تھی۔

سائے پہلے سے زیادہ گہرے محسوس ہو رہے تھے۔

اور ایک انجانی بے چینی مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھی۔

جب میں واپس پلازہ پہنچا تو کیفے کی روشنیاں اندھیرے میں گرمجوشی سے جگمگا رہی تھیں۔

لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

میں نے ہر میز کو غور سے دیکھا۔

کچھ نہیں۔

میں نے کیفے کے مالک سے پوچھا۔

کسی نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔

میں باہر نکلا۔

پارکنگ خالی تھی۔

نہ موٹر سائیکل تھی۔

نہ قدموں کے نشان۔

کچھ بھی نہیں۔

وہ زخمی لڑکی، جو چند منٹ پہلے میرے سامنے گری تھی، یوں غائب ہو چکی تھی جیسے کبھی وجود ہی نہ رکھتی ہو۔

میں نے اگلا ایک گھنٹہ آس پاس کی سڑکوں پر اسے تلاش کرتے ہوئے گزار دیا۔

آخرکار میں ایک بار پھر اسی پارکنگ میں واپس آیا۔

سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔

درختوں کے نیچے صرف اندھیرا باقی تھا۔

تب میری نظر اس جگہ کے قریب پڑی جہاں وہ گری تھی۔

زمین پر ایک سلائی کڑھائی کے ادارے کا شناختی کارڈ پڑا تھا۔

میں نے اسے اٹھایا۔

تصویر اسی لڑکی کی تھی۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔

نیچے ایک تاریخ درج تھی۔

وہ نہ رجسٹریشن کی تاریخ تھی۔

نہ میعاد اختتام کی۔

صرف ایک سال درج تھا۔

2047

میں کئی لمحوں تک اسے گھورتا رہا، پھر خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یقیناً یہ کوئی طباعتی غلطی ہوگی۔

پھر میں نے دوبارہ نظر دوڑائی۔

کارڈ غائب ہو چکا تھا۔

درختوں کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی۔

اندھیرے میں کہیں دور موٹر سائیکل کے انجن کی آواز ابھری، پھر آہستہ آہستہ خاموشی میں گم ہوگئی۔

میں اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، شاید وہ جان بوجھ کر چلی گئی تھی، کیونکہ وہ میرے دل میں کسی سے وابستہ ہونے کے خوف کو محسوس کر چکی تھی۔

کبھی مجھے لگتا ہے کہ تنہائی اور تھکن نے اسے میرے تخیل میں جنم دیا تھا۔

اور بعض شاموں میں، جب اسلام آباد ایک بار پھر دن اور رات کے درمیان اسی دھندلی سرحد پر کھڑا ہوتا ہے، تو میں خود کو اس شناختی کارڈ پر درج اس ناممکن سال کے بارے میں سوچتے ہوئے پاتا ہوں۔

شاید وہ کسی اور زمانے کی مسافر تھی۔

شاید وہ ایسی ہستی تھی جس کا تعلق نہ ماضی سے تھا، نہ مستقبل سے۔

یا شاید وہ کبھی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔

لیکن آج بھی کبھی کبھار، کسی اجنبی سڑک سے گزرتے ہوئے، مجھے مٹی اور بارش کی ہلکی سی خوشبو محسوس ہوتی ہے، دور کہیں سی ڈی 70 کی مدھم آواز سنائی دیتی ہے، اور میں بے اختیار یادوں کی خالی مسافر نشست کی طرف دیکھتا ہوں...

اس امید کے ساتھ کہ شاید وہاں وہی لڑکی بیٹھی ہو، جس کے بازو پر خراشیں تھیں، اور جو صبر سے میرے سینی پلاسٹ لے کر لوٹنے کا انتظار کر رہی ہو۔

☆☆☆☆☆

غزل

ہم نے تجھے بے وفا کہا تھا
یہ کرب بھی ہم نے ہی سہا تھا

عاشق ہم بھی کمال کے تھے
تو بھی اک حد ، اک انتہا تھا

کیا نام تھا ، یاد رکھ نہ پائے
ہر چند سنا تو بار ہا تھا

کیا بات تھی ، کیا چھپا رہے تھے
کیا کہنا تھا اور کیا کہا تھا

ہر سو تھے ، ہمی غبار فرما
تو تھا کہ ہوا کا قہقہہ تھا

اونچی بھی بہت تھیں تیری سوچیں
کج فکر بھی تو بدرجہا تھا

اک حال میں تھے ، تمام ماضی
اک رنگ میں سب کا خوں بہا تھا

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

خالد احمد

غزلیں

اتنا بھی رنگی میں بڑھاتا نہیں اسے
محبوب سے الٰہ بناتا نہیں اسے

دِکھتا نہیں تھا اور کوئی مجھ سوا جسے
اب خود سے ہٹ کے کچھ نظر آتا نہیں اسے

چاہے اُدھڑتے جسم ہوں آنکھوں کے سامنے
منظر کوئی ذرا بھی ہلاتا نہیں اسے

اوروں کی لغزشوں پہ وہ رہتا ہے غیظ میں
اپنا کوئی گناہ ستاتا نہیں اسے

انساں کا اختیار جو ہوتا ورائے حد
وقت اپنی انگلیوں پہ نچاتا نہیں اُسے

اک اس کی دُھن کو آدمی کر لے جو نبضِ جاں
پھر کوئی ہول زار ڈراتا نہیں اسے

سنتا نہ اِس سفر میں اگر وہ صدائے دل
عالی کبھی پکارتا جاتا نہیں اُسے

جلیل عالی

یہ اک یقیں دلِ مضطر کا حوصلہ بھی تو ہے
تُنک مزاج سہی، پر وہ با وفا بھی تو ہے

کڑی کڑی سے ملا اور خود مکمل کر
کہیں کہیں سے فسانہ کہا گیا بھی تو ہے

اب اِس پہ پوری حکومت کے دیکھ مت سپنے
یہ دل جو تیرا ہوا، کچھ نہ کچھ مرا بھی تو ہے

فقط ہوا کی حمایت پہ اتنا شاد نہ ہو
کہ خوفِ نیّت و کردارِ نا خدا بھی تو ہے

فقط دماغ ہی کلّ آدمی نہیں ہوتا
کسی گمان کبھی دل دھمالتا بھی تو ہے

ہُوا نہیں ہے ابھی گم نشانِ منزلِ شوق
کہ اک دیا شبِ صحرا میں جل رہا بھی تو ہے

میں فکر مند ہوں، مایوس تو نہیں عالی
جو نصف خالی ہے آدھا بھرا ہوا بھی تو ہے

غزل

ہر قدم ساتھ چلتے ہوئے لوگ ہیں
آشنائی میں ڈھلتے ہوئے لوگ ہیں

گرتے پڑتے سنبھلتے ہوئے لوگ ہیں
سب سے آگے نکلتے ہوئے لوگ ہیں

ظلم کی بادشاہت کڑی دھوپ ہے
برف جیسے پگھلتے ہوئے لوگ ہیں

اک طرف قہقہہ زن ستم پروری
اک طرف خون اگلتے ہوئے لوگ ہیں

خود سے دامن بچا کر گذرتے نہیں
آگ میں اپنی جلتے ہوئے لوگ ہیں

تیز تر دھوپ میں سوئے منزل رواں
اپنا سایہ کچلتے ہوئے لوگ ہیں

منزلیں مختلف ہیں مگر ہم قدم
رات دن ساتھ چلتے ہوئے لوگ ہیں

آج بھی اپنے رستے میں حائل وہی
چند رستہ بدلتے ہوئے لوگ ہیں

ہم کنور اپنی آزادیاں بیچ کر
عمر بھر ہاتھ ملتے ہوئے لوگ ہیں

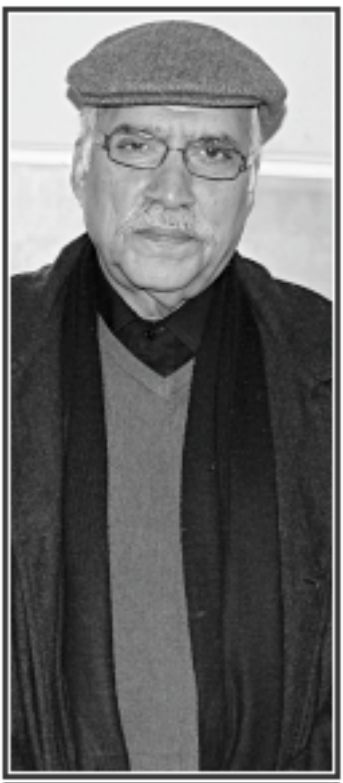

اعجاز کنور راجہ

غزل

مہمان طائروں کا کہاں آشیاں یہ دل
گھر ہے، کوئی سرائے نہیں، یہ کہاں، یہ دل

آوارگی میں بھی نہ چھٹی ہم سے اپنی راہ
ثابت ہوا ہمارے لیے پاسباں یہ دل

اس سے نہیں چھپاتی کوئی بات وہ نگاہ
کرتی ہے اعتبار کہ ہے، رازداں یہ دل

شکوہ مخالفوں سے بھی ہوتا نہیں اِسے
لائے لبوں پہ کیا گلۂ دوستاں یہ دل

ہے شیخ و محتسب کے مقابل ڈٹا ہوا
اے کاش اس جہاد میں ہو کامراں یہ دل

مطلوب ہے نجات اگر اپنے آپ سے
کر دیجیے نثار کسی پر یہ جاں، یہ دل

پیمانہ بے تامّل و تاخیر چاہیے
میخانے آ کے صبر کا قائل کہاں یہ دل

اِس سے کہیں جُدا نہیں ہوتے خیال و خواب
رکھتا ہے اپنے ساتھ عجب کارواں یہ دل

شنوائی کی امید میں ہے نوحہ خواں ہنوز
گو کر چکا ہے پون صدی رائیگاں یہ دل

تکتا ہے خامشی سے اُسے یعنی اے شعور
اُس بت سے بولتا ہے اُسی کی زباں یہ دل

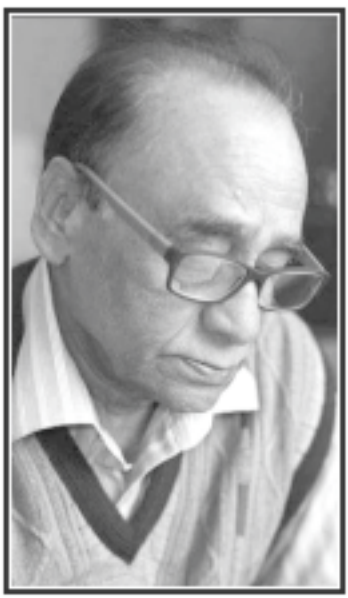

انور شعور

غزلیں

خامشی ٹوٹ پڑی اُن کے ہی دروازوں پر
قدغنیں جن نے لگا رکھی تھیں آوازوں پر

کبھی ہم اُڑتے پھرا کرتے تھے بے خوف وخطر
اَب تو پابندیاں لگ جاتی ہیں پروازوں پر

کتنا محفوظ سمجھتا تھا مَیں اپنے گھر کو
جب محافظ نہیں مامور تھے دروازوں پر

خاور اعجاز

چھپا ہُوا ہے اگرچہ غلاف کے اندر
کلام کرتا ہے کعبہ طواف کے اندر

یہ ہم جو کھوجتے رہتے ہیں ان کو حرف بہ حرف
جہانِ معنی ہے اِس شین قاف کے اندر

اَب اور کیا کہیں تم بھی سمجھ تو سکتے ہو
ٹھہرنا تنہا ہمارا لحاف کے اندر

ٹوٹ جائے نہ کہیں کارگہِ شیشہ گراں
بوجھ اِتنا بھی نہیں ڈالیے دمسازوں پر

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو خاورؔ کب سے
زندگی جیسے گذر جائے گی اندازوں پر

کبھی کبھی نکل آتا ہے اِک خزانہ بھی
اگرچہ سانپ بھی ہووے شگاف کے اندر

وہ مِلنے آیا ہے ماہِ صیام میں خاورؔ
قلق یہ ہے کہ ہیں ہم اعتکاف کے اندر

غزل

راحت سرحدی

فرش کو عرش سمجھنے لگا میخانے میں
ایسا کیا جانے بھرا تھا مرے پیمانے میں

چند لمحاتی تقاضوں کو محبت نہ سمجھ
کچھ خطائیں بھی تو ہو جاتی ہیں انجانے میں

بجھ گئے سارے دیے راستہ تکتے تکتے
آپ نے دیر لگا دی ہے بہت آنے میں

آنکھ جیسی نہیں ہو سکتی کوئی بھی عینک
لمس محسوس کہاں ہوتا ہے دستانے میں

راکھ اُڑتی ہے گھنے پیڑ جہاں ہوتے تھے
لوگ کیا ڈھونڈ رہے ہیں مرے ویرانے میں

ایک دو گھونٹ لگا لے تجھے آسانی ہو
مطلبِ طاعت و تقویٰ مجھے سمجھانے میں

جانے معیارِ شرافت ہے یہاں کیا راحت
ویسے تصویر تو تیری بھی نہیں تھانے میں

غزل

ہوائے تند سے بچ کر گھروندے تو نہیں رہتے
جڑیں جن کی ہوں نازک تر وہ پودے تو نہیں رہتے

یہ بہتر ہے پہاڑوں سے نہ سر پھوڑے کوئی آندھی
جو دریا کے مقابل ہوں وہ ٹیلے تو نہیں رہتے

ہزاروں مسئلے لے کر یہاں عشاق جیتے ہیں
خدا خود ساتھ ہوتا ہے اکیلے تو نہیں رہتے

ملے جس جا سکوں ان کو وہاں مسکن بناتے ہیں
کسی آتش زدہ گھر میں پرندے تو نہیں رہتے

میں اپنی پیار بستی میں محبت بانٹ دیتا ہوں
مرے الفت جزیرے میں درندے تو نہیں رہتے

جلا کر اپنا دامن ہم چراغاں کر ہی لیتے ہیں
تصور کے دریچوں میں اندھیرے تو نہیں رہتے

ہوا کا شور ہے اقبال طوفانوں کی آمد ہے
سمندر جب بپھر جائے سفینے تو نہیں رہتے

اقبال سروبہ

غزل

طالب انصاری

یقیں کی بات کروں تو گماں سمجھتا ہے
وہ میرا ہو کے بھی مجھ کو کہاں سمجھتا ہے

ڈرا ہوا ہے وہ ایسا مری صداؤں سے
میں چپ رہوں تو اسے بھی فغاں سمجھتا ہے

حریمِ شمع کے خوش وقت لوگ کیا جانیں
دھوئیں کا درد ہے کیا یہ دھواں سمجھتا ہے

محبتوں میں خسارے کی جستجو ہے کیا
یہ رمز عاملِ کارِ زیاں سمجھتا ہے

میں سنگ پھینک کے لہریں بنانے لگتا ہوں
تو آبِ چاہ بھی خود کو رواں سمجھتا ہے

فریبِ خندہ ءِ گل کا ستم رسیدہ دل
بہار کو بھی ہمیشہ خزاں سمجھتا ہے

اسی لیے تو بٹھاتا ہے پچھلی صف میں مجھے
کھلاڑی وہ بھی مجھے بارہواں سمجھتا ہے

غزل

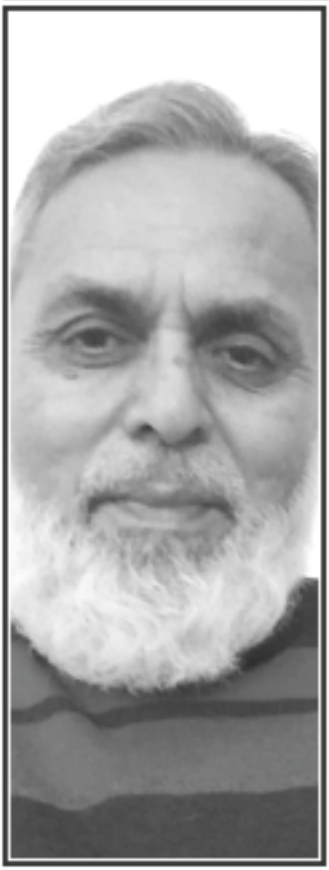

برسوں پُرانی تصویروں کو دیکھ رہا ہوں
چہرہ چہرہ تنویروں کو دیکھ رہا ہوں

سب کچھ بدل گیا ہے، لفظ نہیں بدلے ہیں
اس کے ہاتھ کی تحریروں کو دیکھ رہا ہوں

کیسے کیسے خواب تھے، ان آنکھوں میں جگمگ
کیسی کیسی تعبیروں کو دیکھ رہا ہوں

کن درویشوں اور فقیروں کی مسند پر
یہ کیسے کیسے پیروں کو دیکھ رہا ہوں

آج بھی اُن کی قید میں ہوں میں، جانِ انیس!
آج بھی اپنی زنجیروں کو دیکھ رہا ہوں

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا میں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

قیوم طاہر

تم ایڑیاں بھی اٹھاؤ تو قد نکلتا نہیں
کہ صِفر سے تو کوئی بھی عدد نکلتا نہیں

یہاں تو ڈوبنے والے پہ شرط لگتی ہے
یہاں پہ ہاتھ برائے مدد نکلتا نہیں

یہ زائچہ تو مری دسترس میں آتا ہے
مگر ستارہ مرا نیک و بد نکلتا نہیں

میں اس لیے بھی بہت کھلکھلا کے ہنستا ہوں
کہ میرے یاروں کے دل سے حسد نکلتا نہیں

کوئی قبول بھی کرتا نہیں مرا لہجہ
کسی زباں سے مگر حرفِ رد نکلتا نہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ مل گیا ہے تو پھر پیار کر کے دیکھتے ہیں
نئے سرے سے یہ غم پار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

آئینے کا منہ تحیر سے کھلا رہ جائے گا
جس نے دیکھی تری صورت دیکھتا رہ جائے گا

ہم نے سب کچھ تج دیا تری رفاقت کے لیے
تجھ سے دوری میں ہمارے پاس کیا رہ جائے گا

سلسلے اُمید کے ناامیدیوں کی نظم ہے
آندھیوں میں کون سا روشن دیا رہ جائے گا

جانے والوں کی کمی پوری کبھی ہوتی نہیں
آنے والے آئیں گے لیکن خلا رہ جائے گا

مل سکیں گے تجھ سے خوابوں میں کہاں بچھڑے ہوئے
نیند صدمے سے اُڑے گی، رتجگا رہ جائے گا

کشمکش تیرے حوالے سے قیامت ڈھائے گی
حشر قلب و ذہن میں پیہم بپا رہ جائے گا

ہیر کو گلزار لے جائیں گے کھیڑے چھین کر
بانسری پر تو نوائیں چھیڑتا رہ جائے گا

گلزار بخاری

غزل

بہ خال آں پری رُو جان قرباں
توانم دید گر دست عطا را

بہ نطق آں دہن ایمان قرباں
من و ایں گوشہ دامان قرباں

کجا شانے کہ شایان تو گردد
اگر تو بر درت یک بار خوانی

بہ حسنش یوسف کنعان قرباں
بہ مہرت ساجد دربان قرباں

فقط یاد تو ماند در دل و جاں
دگر جملہ سر و سامان قرباں

تو جانِ عالم و رشکِ مسیحا
بتو ہر لحظہ صد ہا جان قرباں

ببیند ہر نظر حُسن نظر باد
ترا دیدہ شدہ حیران قرباں

بخواہم دیدنش ہر شب بخواہے
برآں نظارہ ایں چشمان قرباں

ترشح می شود شوخی ز چشمت
کنم مستی و مے ہر آن قرباں

شریف ساجد

غزل

تم گزرو اور وقت نہ ٹھہرے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے
یاد آؤ اور درد نہ بھڑکے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

صبر کیا ہے، شکر کیا ہے، راضی ہو کر دیکھ لیا ہے
لیکن دل کو چین آ جائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

ترکِ محبت کر لینے سے ترکِ محبت ہو بھی جائے
کوئی اُسے جا کر سمجھائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

جب تم نے سب راز کی باتیں، گوشِ موجِ ہوا سے کہہ دیں
شاخ و شجر تک بات نہ پہنچے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

گزرا لمحہ گزر گیا ہے، اُس پر اشک بہانا کیسا
مٹھی میں پانی آ جائے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

پہلے جیسا نہیں ہے کچھ بھی، اس پہ تعجب کرنا کیسا
دنیا ہو اور رنگ نہ بدلے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

یہ تو پہلے سوچنا تھا وہ پہلے جیسی بات نہ ہوگی
دل ٹوٹے اور بال نہ آئے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

لب پر مہریں لگ سکتی ہیں، بازو توڑے جا سکتے ہیں
کوئی طاقت سے دل جیتے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

تم ایسا تو کر سکتے ہو ظلم کو ہی دستور بنا لو
لیکن سب میں بات نہ پھیلے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

شاہنواز زیدی

غزل

باطل سے اگر برسرِ پیکار نہیں ہیں
کیا ولولے ایمان کے بیکار نہیں ہیں

ہم بھی ہیں اسی منزلِ پرشوق کے راہی
ہمراہ چلیں گے ترے، دیوار نہیں ہیں

کہلاتے ہیں جو رشکِ گل و بلبل و ریحاں
کیوں باعثِ تزئینِ چمن زار نہیں ہیں

بس داغ ہیں پامال ہوئے گرد کے ہاتھوں
جو رنگِ فدائے زرِ رخسار نہیں ہیں

بلبل تھے کبھی نغمہ سرا، اُڑ گئے آخر
اب محفلیں ویسی گل و گلزار نہیں ہیں

غزہ کو یوں برباد کیا اہلِ ستم نے
اب کے نئی تعمیر کے آثار نہیں ہیں

اب نیند کے ماتے ہیں رضا مردوں سے بدتر
جو جاگنے والے ہیں وہ بیدار نہیں ہیں

رضا اللہ حیدر

غزل

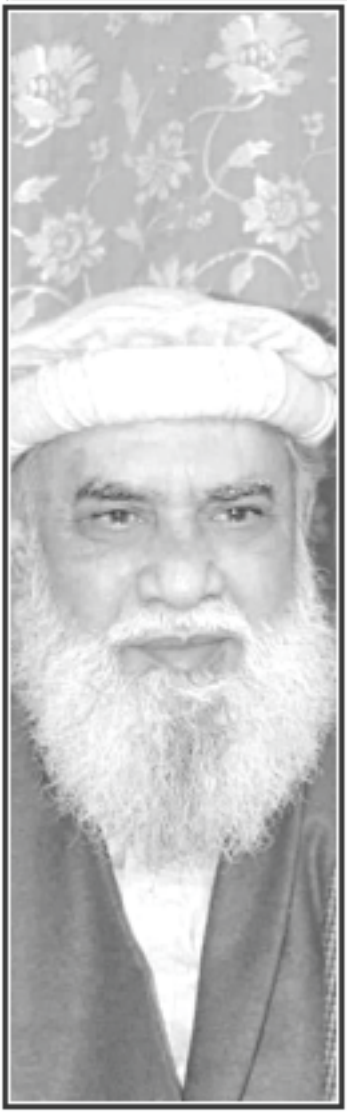

بچھڑتے وقت بڑا مطمئن تھا وہ کہ اسے
یقیں نہیں تھا بتایا گیا تھا جو کہ اسے

وہ جان بوجھ کے باتیں سمجھ نہیں رہا تھا
معاملہ تو میں سمجھا چکا تھا گو کہ اسے

نکالنا ہے کسی طور خواب غفلت سے
تو تیز دھار کا نشتر کوئی چبھو کہ اسے

پتہ چلے کہ ابھی انتظار جاری ہے
سنو میاں ذرا آواز اس کو دو کہ اسے

اگا کے شہر میں تعبیر کوئی بانٹ سکیں
تو چشم نم میں کسی خواب کو ہی بو کہ اسے

جواب اس کے ہی لہجے میں دے سکوں اکرم
میں سوچتا ہوں کسی روز ایسا ہو کہ اسے

اکرم ناصر

غزل

چاندنی رات ہے، صدا کیجے
سائے سائے کو ہم نوا کیجے

اپنے حصے کی دھوپ لیں ، لیکن
دوسروں کا بھی راستہ کیجے

جو میسر ہوئے ، وہی اپنے
جاتے لمحوں کو مت گنا کیجے

روشنی بھی ہے آپ کے اندر
اپنے صورت سے مت ڈرا کیجے

ورنہ تنہائی بے حقیقت ہے
یہ رفاقت ، پرکھ لیا کیجے

ساتھ آ بیٹھے جو ، وہی اپنا
جو گیا اُس کا مت گلہ کیجے

لے بھی جاتے ہیں گم رہی کی دشا
راستہ دیکھ کر چلا کیجے

ہم نے دل کو ہی رہنما پایا
آپ بھی دل کا راستہ کیجے

اک یہی دوست ہے کھرا اپنا
آئنے سے نہ فاصلہ کیجے

اس قدر اوڑھنا بھی کیا خود کو
اپنا احوال آئنہ کیجے

ختم اس پر ہے زندگی کی کتاب
باب دیوانگی پڑھا کیجے

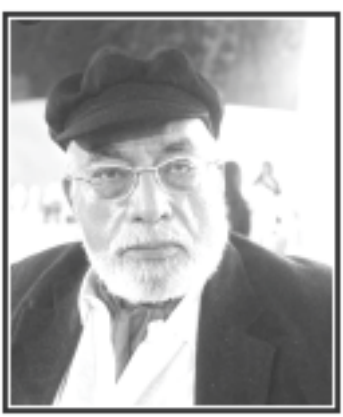

طارق بٹ

غزل

جہاں طاغوت کا زیر و زبر کرتے تو کیسا تھا؟
سرِ مقتل کوئی حق بات گر کرتے تو کیسا تھا؟

شعاعِ مہر سے پتھر کو کرتے موم کی صورت
کسی کے دل میں خاموشی سے گھر کرتے تو کیسا تھا؟

مقدر میں ہمارے تھی ازل سے آبلہ پائی
کسی بھی دشتِ ویراں کا سفر کرتے تو کیسا تھا؟

ہوائے تندیٔ نفرت سے اس کو اوٹ میں رکھتے
محبت کے شجر کو بارور کرتے تو کیسا تھا؟

سزا جس جرم کی اب تک، دلِ وحشی نے جھیلی ہے
وہی جرمِ وفا بارِ دگر کرتے تو کیسا تھا؟

اگرچہ پنکھ گھائل تھے، مسافت تھی، تھکن بھی تھی
مگر ہمت کو پنچھی بال و پر کرتے تو کیسا تھا؟

خطابت سے جنابِ شیخ، دل تسخیر کیا کرتے
یہی باتیں اگر اہلِ ہنر کرتے تو کیسا تھا؟

ہمارا فقر ہوتا تھا، ہمارے فخر کا باعث
حیات چند روزہ یوں بسر کرتے تو کیسا تھا؟

نئے رستوں پہ چلتے، منزلِ نو کی تمنا میں
سراسر برخلافِ راہ بر کرتے تو کیسا تھا؟

نگارِ شہرِ دل کے نرم و نازک تار مژگاں سے
رفوگر جو رفو زخمِ جگر کرتے تو کیسا تھا؟

ہماری ہی طبیعت میں تھا عفو و درگزر شوکت
خطاؤں سے سدا صرفِ نظر کرتے تو کیسا تھا؟

شوکت محمود شوکت

غزل

سعد اللہ شاہ

ہوئی جو شام تو آنکھوں میں دیپ جلنے لگے
زمین دل سے بھی چشمے سے کچھ ابلنے لگے

یہ کس مقام پہ لائی ہے آگہی ہم کو
تماشہ دیکھنے والے تماشہ لگنے لگے

خزاں میں پکتے ہیں جیسے ثمر درختوں پر
میں لکھنے بیٹھا تو شعروں میں رنج ڈھلنے لگے

خدا کو بھی تو یہ یکسانیت پسند نہیں
تو کیا ہوا مرے موسم اگر بدلنے لگے

امید باندھی خدا سے تو یوں لگا مجھ کو
خوشی کے اشک چراغوں کی اور جلنے لگے

جو دل میں گریہ تھا چہرے پہ آ گیا کیسے
تمام لوگ مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگے

خدا کو بھولا ہوا تھا مگر میں نادم تھا
تو سعد لمحے مری زندگی میں بھرنے لگے

غزل

غافر شہزاد

میں نے تو گھر بنایا تھا اپنا گھروں کے بیچ
خود کو اٹھائے پھرتا ہوں، اب دو پروں کے بیچ

دل مصلحت کے عہد میں بھی سرکشیدہ تھا
سر اپنا سر بلند رہا ہے، سروں کے بیچ

یہ لاتعلقی تو غنیمت ہے مجھ کو دوست!
کھوتا ہوں اور رہتا ہے مجھ کو کھروں کے بیچ

اب دیکھیں، کس کی آنکھ میں اتریں سلائیاں
پھر حسن جلوہ گر ہوا آہن گروں کے بیچ

گاہے جلال سامنے، گاہے جمال تھا
اک جنگ چھیڑ دی گئی دیدہ وروں کے بیچ

مدت ہوئی میں رویا نہیں رفتگاں کو
کچھ دیر مجھ کو رہنے دو نوحہ گروں کے بیچ

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

انتخاب
— خالد احمد —
نعمان منظور

غزل

چشم تر سے دیدۂ نم سے واقف ہو
کوئی ہو جو شہر میں ہم سے واقف ہو

منزل اس کے پاؤں چوما کرتی ہے
جو رستے کے پیچ و خم سے واقف ہو

سنکاری سے یوں لگتا ہے جیسے تم
سرگم ، بندش، تال اور سم سے واقف ہو

اس کو بھی تاریخ بتانی پڑتی ہے
جو دنیا کے کیف و کم سے واقف ہو

شب کو اک آواز کہیں سے آتی ہے
کوئی ہے جو میرے غم سے واقف ہو

پوریں رکھتی ہو تو بھرتے ہیں سب زخم
تم خود مرہم ہو ، مرہم سے واقف ہو

دن سورج کا والی وارث ہے تابشؔ
رات وہی ہے جو شبنم سے واقف ہو

تابش کمال

غزلیں

مہر و ماہ چمک جاتا ہے
خالی جام چھلک جاتا ہے
صبح ستارے سو جاتے ہیں
شام کو سورج تھک جاتا ہے
کب ڈوبی ہے خواب کی ناؤ
کاغذ کب تہہ تک جاتا ہے
دشت میں چُپ تک بول اُٹھتی ہے
روح میں غم بھی چھک جاتا ہے
دل سے یاد لپٹ جاتی ہے
ہاتھ سے ہاتھ کھسک جاتا ہے

نم جھونکوں کی فوج کے سر پر
پرچمِ ابر ہمک جاتا ہے
پیاس لبوں تک آتے آتے
پھل پیڑوں پر پک جاتا ہے
حُسن میں جذبے کھل جاتے ہیں
پھول یمں رنگ مہک جاتا ہے
اک چنگاری دیکھ تو جمشید
شعلہ ایک لپک جاتا ہے

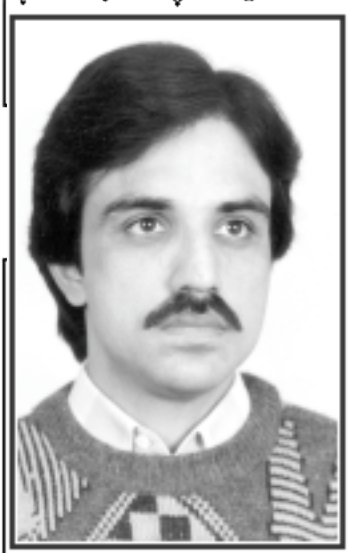

جمشید چشتی

چراغ سے بھی نہ لپٹے دھواں ہوکر
سمٹ گیا ہوں میں سورج کو آسماں ہوکر

ہم ایک ناؤ بھی پہنچا سکے نہ ساحل تک
ہمارے ساتھ نہ ہو پاتے بادباں ہو کر

قدم قدم کبھی صحرا پہ نقش ہیں معدوم
یہ خاک پا اُسے پائیں گے بس نشان ہوکر

جدائی وصل میں ہوکر نہ پھیل جائے کہیں
ہمارا عشق نہ رہ جائے داستاں ہو کر

میں وقت بن کے کسی حادثے میں اُبھروں گا
نظر کی حد سے نکل جاؤں گا ، عیاں ہوکر

وجود، نقشِ قدم بن چکا ہے اب جمشید
یہ مشیتِ خاک رہی میرِ کارواں ہوکر

غزلیں

غم کیا جو میرے ساتھ اجالا نہیں رہا
میں فرض کر چکا ہوں اندھیرا نہیں رہا

بیعت میں میری آ گئے دو چار دل جلے
اللہ کا لاکھ شکر میں تنہا نہیں رہا

جب تک تھی روشنی وہ رہا میرے ساتھ ساتھ
آئی جو رات ساتھ میں سایا نہیں رہا

ثابت کروں میں کیسے کہ میرے تھے تم کبھی
کوئی بھی زندگی میں حوالہ نہیں رہا

اک ایک کر کے زخم ہیں سارے ہی بھر گئے
تیرے بغیر تھا جو خلا سا نہیں رہا

بستی کے سارے لوگ ہی شہروں میں آ گئے
لگتا تھا وہ جو گاؤں میں میلہ نہیں رہا

اے۔آئی کا یہ فیض ہے صادق جمیل سب
بچہ جدید دور کا بچہ نہیں رہا

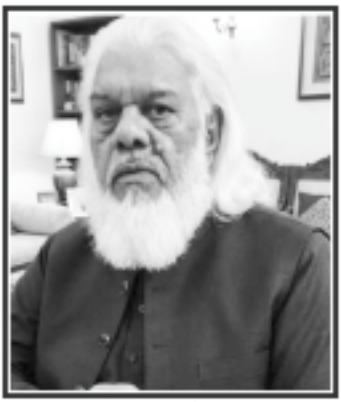

صادق جمیل

دستخط جاتے جاتے کر جانا
موت کا یہ پڑا ہے پروانہ
آپکے کچھ بھی ہم نہیں لگتے
پھر یہی ایک بار فرمانا
یونہی بس میں نہیں سوار ہوئے
ہم کو آتا ہے جیب کٹوانا
کام مشکل تو ہے ، اگر ہو جائے
اپنے بارے میں خود کو اُکسانا
میرے نزدیک لوگ پاگل ہیں
جو سمجھتے ہیں مجھ کو دیوانہ

میں فراموش کر چکا تھا جسے
پڑ گیا پھر سبق وہ دُہرانا
محو ہے حالتِ نماز میں گُل
شور ان تتلیوں کا رُکوانا
روشنی کیا ہے تیرگی کیا ہے
تیرا آنا ترا چلے جانا
ہو ملاقات اس کی تم سے اگر
مجھ سے صادق جمیل مِلوانا

غزل

چاہتا ہوں میں سہارا کوئی
لا سرابوں کا کنارا کوئی

شوق کی راہ میں ہے گرد گماں
کیا یقیں ہو گا دوبارا کوئی

اک مسلسل تہی دامانی ہے
درد ہے اور نہ چارا کوئی

کرچی کرچی ہوں سرِ راہِ وفا
کرے تعمیر دوبارا کوئی

ذات کے دشت میں بھٹکا ہوا میں
کاش مل جائے ستارا کوئی

مل ہی جائے گا کوئی عابد کو
ہو ہی جائے گا تمھارا کوئی

عابد خان عابد

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہر گلی ، ماہ رخی ، مہر سنی کے چرچے
کوئی سنتا ہی نہیں در بدروں کا رونا

غزل

گفتگو اجتناب کرتی ہے
آئنے سے حجاب کرتی ہے

بزم میں کس جگہ ٹھہرنا ہے
آنکھ خود انتخاب کرتی ہے

سود ہو اس میں یا خسارہ ہو
کب محبت حساب کرتی ہے

لوٹ جانے کی دفعتاً ساعت!!!
نازل ایسا عذاب کرتی ہے

بارہا داستاں ادھوری سی
اک رقم اور باب کرتی ہے

تو فقط دیکھتی ہے کب اس کو
رویت ماہتاب کرتی ہے

بے سبب وہ کبھی نہیں آیا
یاد تو بے حساب کرتی ہے

اپنا من چاہا شخص مل جائے
سر خوشی لاجواب کرتی ہے

اس کی موجودگی سر محفل
سارا موسم گلاب کرتی ہے

لب کو چھوتے ہی بوند رخشندہ
سادہ پانی شراب کرتی ہے

رخشندہ نوید

غزل

آنکھ میں ، دل میں ، گھر میں سناٹا
آج تو ہے دہر میں سناٹا

یہاں دل کی زمین ہے خاموش
وہاں شمس و قمر میں سناٹا

ایک کہرام تھا یہاں پہلے
اب تو ہے شہر بھر میں سناٹا

جتنا چہکیں پرندے شاخوں پر
اتنا گہرا شجر میں سناٹا

آخری سانس بھی سنائی دی
اِس قدر تھا بھنور میں سناٹا

خامشی اوڑھ کے ڈراتا ہے
رات پچھلے پہر میں سناٹا

ہُو کا عالم ہے دل کے آنگن میں
جیسے ہو دوپہر میں سناٹا

ہے تقاضا جہیز وافر ہو
نان و نفقہ ، مہر میں سناٹا

خالدہ انور

غزل

کبھی خیال ، کبھی خواب میں تماشا ہے
حیات و موت کے ہر باب میں تماشا ہے

جو اشک گرتا ہے، گرتا ہے رقص کرتے ہوئے
یہ کیسا دیدہ خوں ناب میں تماشا ہے

دل ایک بحر ہے ایسا کہ بحر میں دل کے
ہر ایک موجۂ گرداب میں تماشا ہے

بنامِ مہر و مروّت کئی زمانوں سے
صفِ عدو ، صفِ احباب میں تماشا ہے

کسی بھی رنگ میں ہلچل ہو، لازمی ہے بہت
کہ سنگ پھینکیے تالاب میں تماشا ہے

کوئی سُلگتا ہے تنہا ، مہک رہا ہے کوئی
یہ آج کیا شبِ مہتاب میں تماشا ہے

بڑھا نہ اِتنی کہ بہہ جائے تو بھی ریلے میں
کہ خواہشات کے سیلاب میں تماشا ہے

ترے بھی قُرب میں اب کے سکوں نہیں کوئی
عجیب سا دلِ بے تاب میں تماشا ہے

خدا کرے تری غزلوں میں بھی نظر آئے
جو سوز و ساز میں مِضراب میں تماشا ہے

ہر ایک شخص کے ہاتھوں میں ڈُگڈگی ہے نبیل
جہانِ شوق کے ہر باب میں تماشا ہے

نبیل احمد نبیل

غزل

تحریر لگی ہاتھ جو منظوم کسی کی
اس واسطے ہر سُو ہے مچی دھوم کسی کی

رکھا ہے تبھی ہجر کو سینے سے لگا کر
چھن جائے نہ یہ دولتِ مقسوم کسی کی

تجھ کو تو مقدر میں ملی تخت نشینی
کیا دکھتی تجھے قسمتِ محروم کسی کی

طاقت کے نشے میں ابھی مدہوش ہے ظالم
لے ڈوبیں گی آہیں اُسے ،مظلوم کسی کی

اس دل کی حویلی میں جو رونق سی لگی ہے
رہتی ہے یہاں چاہتِ مکتوم کسی کی

پتھر کو لیے پھرتے ہیں پہلو میں اُٹھائے
دلجوئی نہیں کرتے جو مغموم کسی کی

تاوان جسے بھرنا ہو سانسوں کا بھی ارشد
وہ زیست بھی کیا زیست ہے محکوم کسی کی

ارشد محمود ارشد

غزل

شہ رگ سے بھی قریب میرے دِلربا ہے تُو
آنکھیں ترس رہی ہیں نظر سے چھپا ہے تُو

رُوح و بدن کا محور و مرکز ہے تیری ذات
عقل و شعور و فہم کی حد سے ورا ہے تُو

ظاہر میں ڈھونڈیئے تو مِلے گا چھپا ہُوا
دیکھیں نگاہِ دِل سے تو جلوہ نُما ہے تُو

اِک وحدت الوجود ہے تیرا پتہ نشان
بزمِ تعینات میں سب سے جُدا ہے تُو

اِس میں نہیں ہے کافر و مومن کا امتیاز
کوئی بھی درد مند ہو، درد آشنا ہے تُو

کس پر ہے جبر، کس کے لئے اختیار ہے
یہ تیرے بھید ہیں اِنہیں بس جانتا ہے تُو

جیسے بھی ہیں تیرے ہی بنائے ہوئے ہیں ہم
اپنا یہ فخر و ناز بجا ہے، خدا ہے تُو

تیرا ہر اِک عمل ہے مشیئت کے سائے میں
فیضانؔ، جو بھی کچھ بخدا کر رہا ہے تُو

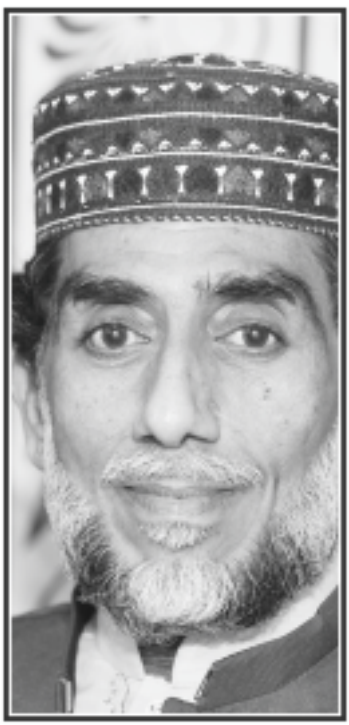

فیض رسول فیضان

غزل

ترکِ تعلق مجبوری تھی اور اُس کی دانائی بھی
ورنہ جانے کیا ہو جاتا اور ہوتی رسوائی بھی

دیکھنے والا کیسے روکے دل کو اُس پر آنے سے
ایک تو اُس کی ہنسی قیامت، اُس پہ غضب انگڑائی بھی

عین مجسّم کر کے اُس کو سامنے لا بٹھلاتی ہے
کبھی کبھی تو حد کر دیتی ہے دل کی تنہائی بھی

من آنگن میں دھیرے دھیرے کرتا ہے جب عشق ظہور
دھری پڑی رہ جاتی ہے بینائی بھی، دانائی بھی

ایک اکیلا ایک طرف ہو اور ہجوم ہو ایک طرف
جھوٹ ہی لگنے لگ جاتی ہے ایسے میں سچائی بھی

سوچ رہے ہیں کیسے چلے گا خرچہ سگرٹ چائے کا
ایک تو اپنا کیسہ خالی اُس پر ہے مہنگائی بھی

عزت، شہرت مل جانے پر نازش! اتنا دھیان رہے
ظرف نہ ہو تو چھوٹا کر دیتی ہے بہت اونچائی بھی

شبیر نازش

غزل

خواب دیکھا نہیں تھا ہجرت کا
وقت ضائع ہوا ہے فرصت کا

بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے
ایک لمحہ اگر ہے راحت کا

ہر کسی کو سنا نہیں سکتا
ایسا قصّہ ہے تیری چاہت کا

اپنی نظروں سے کھو دیا ہے اُسے
فائدہ کیا ہُوا سہولت کا

بزمِ غیراں میں راز رکھتے ہیں
یہ تو موقع نہیں شکایت کا

جانو اُس کا ضمیر کوئی نہیں
جس نے بدلا لیا عداوت کا

یہ محبت ہے کاروبار نہیں
یہ تو قصّہ نہیں تجارت کا

تجھ سے طاہر ہے واسطہ دل کا
تجھ سے رشتہ نہیں ضرورت کا

طاہر حفیظ

غزل

لاکھ مائل رہو خوشی کی طرف
دُکھ روانہ ہیں آدمی کی طرف

آنکھ نے پیڑ سوکھتا دیکھا
دل نے دیکھا تری کمی کی طرف

یہ سڑک جو کہیں نہیں جاتی
روز جاتی تھی اُس گلی کی طرف

وقت آگے نکل چکا تھا سلیم
دیکھتا رہ گیا گھڑی کی طرف

یاد کی شاہراہ آخرِ کار
جا نکلتی ہے بے خودی کی طرف

وہ کسی کی طرف نہیں ہوتا
وہ جو ہوتا ہے ہر کسی کی طرف

یاد آتا ہے جب وہ زہرہ جمال
دھیان جاتا ہے روشنی کی طرف

میں ترے واسطے سے لے آیا
دل نہ آتا تھا زندگی کی طرف

انگلیاں چار خود پہ اُٹھتی ہیں
ایک اُٹھتی ہے جب کسی کی طرف

محمد سلیم ساگر

غزل

آنکھ کا خواب دَر کُھلے گا
سوچ پرواز چڑیا گھر سے
خواب پُر آب دَر کُھلے گا
سہمے سُرخاب دَر کُھلے گا

کہہ رہا ہے جوار بھاٹا
آبلہ پائی پَہ پھٹے گی
میرے مہتاب دَر کُھلے گا
کالی محراب دَر کُھلے گا

اے زلیخا سپردگی میں
بُوندا باندی شروع ہوئی ہے
ہو کے بیتاب دَر کُھلے گا
اشکِ سیلاب دَر کُھلے گا

تیری خاطر غُلامِ کِنعاں
ایک نایاب دَر کُھلے گا

خُوں چُھپاتے سفید پاؤں
ایک شاداب دَر کُھلے گا

ایڑیوں پر جُھکے گا چشمہ
باغِ بے آب دَر کُھلے گا

تنویر قاضی

غزل

اصغر علی بلوچ

وہ ہمیں ہم انھیں یاد کرتے رہے دن گزرتے رہے
خشک پتے زمیں پر بکھرتے رہے دن گزرتے رہے

شہر یارِ انا کو خبر ہی نہیں شہر میں کیا ہوا
لوگ جیتے رہے لوگ مرتے رہے دن گزرتے رہے

جاں ہتھیلی پہ لے کے لہکتے رہے ہم شکستہ بدن
زخم رستے رہے، زخم بھرتے رہے دن گزرتے رہے

جن کے وعدوں پہ رکھی تھی بنیادِ جاں پہلے سے وہ کہاں
وعدہ کرتے رہے اور مکرتے رہے دن گزرتے رہے

اس کی چاہت کا ساون برستا رہا ، دل اُمڈتا رہا
ہم نکھرتے رہے اور سنورتے رہے دن گزرتے رہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پالنوں کی عُمروں سے اب ہمیں نکلنے دے
خاک میں لتھڑنے دے پاؤں پاؤں چلنے دے

غزل

تو نے جس نعمت عظمیٰ کو بھلایا ہوا ہے
میں نے اُس عشق کو سینے سے لگایا ہوا ہے

سنگ بے مایہ کو تکریم کا درجہ دے کر
دل سے پتھر پہ ترا نقش بنایا ہوا ہے

دیکھ نادار کو منت کشِ آزار نہ کر
کوئی منت سے مجھے مانگ کے لایا ہوا ہے

دشت رہتا ہے مرے لمس کی وسعت کے شمال
جب کہ عالم مرے پوروں میں سمایا ہوا ہے

موت رو کے گی مرے پیکرِ خاکی کی دھمال
عالمِ کیف مجھے وجد میں لایا ہوا ہے

شق ہوا جب سے دلِ آبلہ پا تیرے سبب
عشق کے عین کو ابجد سے ہٹایا ہوا ہے

لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں مل کر تجھ سے
اور مجھے دیدہ و دانستہ بٹھایا ہوا ہے

ایک مدت ہوئی تحلیل ہوا ہوں تجھ میں
تیرا قالب مجھے تشکیل میں لایا ہوا ہے

عابدی میں نے ترا ساتھ نبھا کر اب تک
تجھ سے رشتہ تو بہر طور نبھایا ہوا ہے

علی حسین عابدی

غزل

لے کوئی باقی نہیں ہے نغمگی باقی نہیں
زندگی میں اب کوئی بھی چاشنی باقی نہیں

بڑھ رہا ہے مسجدوں کی سمت لوگوں کا ہجوم
میکدے تو ہیں مذاقِ میکشی باقی نہیں

کیا کرو گے روک کر شہرِ محبت میں مجھے
اب یہاں کوئی اصولِ دوستی باقی نہیں

رات بھر یوں جاگتا ہے کُوچہ کُوچہ شہر کا
روشنی ہی روشنی ہے تیرگی باقی نہیں

ظلم سہہ کر بھی لبوں پر ہے ہنسی پھیلی ہوئی
بے بسی تو ہے خیال بے بسی باقی نہیں

کیوں جنوں اب کھینچ کر لاتا نہیں صحرا کی سمت
چاندنی راتوں میں کیوں وہ ساحری باقی نہیں

کھا گئی احساس کے جذبے ریاکاری کی دھول
آنکھ تو پُرنم ہے دل میں بے کلی باقی نہیں

جو بنا کرتے تھے منزل تک رسائی کا سبب
رہبروں میں اب وہ شانِ رہبری باقی نہیں

شہرِ دل سے سب ہی اک اک کر کے رخصت ہو گئے
آشنا کیا اب تو کوئی اجنبی باقی نہیں

سرور فرحان

غزل

کئی زمانوں سے ہوتا زمین تک پہنچا
میں تھا تو نُور مگر ماہ وطین تک پہنچا

نظر کے سامنے حائل تھیں ظلمتیں کیا کیا
میں جن کو چیر کے نُورالمبین تک پہنچا

یہ حسن جوئی تو بچپن سے میری عادت ہے
میں ماہتاب سے اُس مہ جبین تک پہنچا

نہیں ہوا ہوں کبھی مطمئن میں کم تر پر
خدا کا شکر کہ اب بہترین تک پہنچا

مجھے مجاز سے آئی سمجھ حقیقت کی
میں کوئے یار کو نکلا تو دین تک پہنچا

گماں کے گہرے سمندر تھے راستے میں، جنھیں
عبور کر کے میں عین الیقین تک پہنچا

جسے جہان میں ڈھونڈا وہ اپنے گھر سے ملا
میں دل کو لوٹا تو دل کے مکین تک پہنچا

میں آپ اپنے حجابات کو ہٹاتا رہا
یوں ایک دن رخِ پردہ نشین تک پہنچا

تماش بین زمانے سے بچ بچا کے نواز
بڑے بھرم سے میں تجھ دردبین تک پہنچا

احمد نواز

غزل

کوئی دعا کوئی التجا زیرِ لب نہیں ہے
وہ بے دلی ہے کہ دل میں کوئی طلب نہیں ہے

مرے قبیلے میں لوگ دشمن کے آ ملے ہیں
مری ہزیمت کچھ ایسی بھی بے سبب نہیں ہے

جنہیں قرینے سکھائے ہم نے محبتوں کے
وہ نفرتیں ہی بڑھا رہے ہیں غضب نہیں ہے؟

سحر کے ماتھے پہ بھی نہیں ہے چمکتا سورج
فروزاں ماہ و نجوم سے بھی تو شب نہیں ہے

وہ لوگ بھی معتبر ہوئے ہیں، خدا کی قدرت!
جلیل جن کا کوئی بھی نام و نسب نہیں ہے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ڈھونڈتی ہیں کب سے جیون کے سپنوں کی تعبیر
میری خالی آنکھیں میرے خوابوں کے نخچیر

غزل

جہاں دیوار و در کوئی نہیں ہے
نہ یہ سمجھو کہ گھر کوئی نہیں ہے

کہاں کوئی بنائے آشیانہ
چمن میں جب شجر کوئی نہیں ہے

میں اس میں کھو گیا ہوں اس طرح سے
مجھے اپنی خبر کوئی نہیں ہے

یہ بازار محبت ہے یہاں پر
ہو قیمت جس کی زر کوئی نہیں ہے

جمانے اعتبار آئے بہت سے
یہ دیکھا معتبر کوئی نہیں ہے

شجر خون جگر سے سینچنا کیا
کہ جب حاصل ثمر کوئی نہیں ہے

کہاں جذب اپنے آنسو ہو رہے ہیں
یہاں بزم سحر کوئی نہیں ہے

کیا جائے جو طے اک تیری جانب
تو اس جیسا سفر کوئی نہیں ہے

تو کیا تھک ہار کر ہم بیٹھ جائیں
جو آہوں میں اثر کوئی نہیں ہے

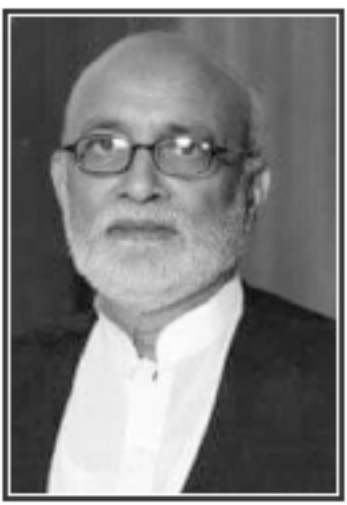

محمد افضال انجم

غزل

اعجاز دانش

کوئی خوش رنگ اشارہ بھی تو کر سکتا ہے
وہ مجھے چھو کے ستارہ بھی تو کر سکتا ہے

یہ بھی امکان مرے دھیان میں رہتا ہے میاں
مجھ سے وہ شخص کنارہ بھی تو کر سکتا ہے

عشق کرتے ہوئے آیا ہے کئی بار خیال
آدمی اپنا خسارہ بھی تو کر سکتا ہے

جس نے ہر حال میں رہنا ہے ترا بن کے غلام
وہ ترا ہجر گوارہ بھی تو کر سکتا ہے

رہ کے دنیا میں کوئی ، دیکھ کے تجھ کو کوئی
باغ جنت کا نظارہ بھی تو کر سکتا ہے

اعتبار اس نے دلایا تو ہے دانش مجھ کو
وہ یہی کام دوبارہ بھی تو کر سکتا ہے

غزل

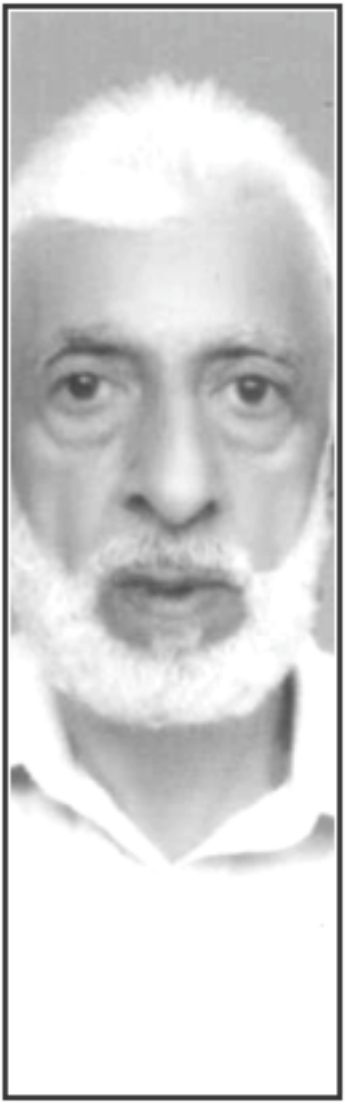

کتنی معصوم آرزو کی تھی
تُم سے ملنے کی جُستجو کی تھی

دل دماغ آج تک معطر ہیں
اُن سے اک بار گفتگو کی تھی

وہ مُقدر ہوئی رقیبوں کا
ہم نے جس شے کی آرزو کی تھی

اُس کے آنگن میں کیوں اندھیرے ہیں
روشنی جس نے چارسو کی تھی

خار جھولی میں بھر گئی قسمت
ہم نے پھولوں کی آرزو کی تھی

اُنگلیاں ہیں لہُو لہُو شاہد
ہم نے توقیرِ رنگ و بو کی تھی

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

کبھی وہ رنج، کبھی اضطراب دیتے رہے
ہمیں وہ پیار میں کیسا عذاب دیتے رہے

ہمارا جرمِ محبت ہی معتبر ٹھہرا
تمام عمر اُسی کا حساب دیتے رہے

گزر گئی ہے اسی کشمکش میں عمرِ رواں
ورق ورق انہیں دل کی کتاب دیتے رہے

نصیب میں تھی پریشانیِ شبِ ہجراں
وہ جاگتی ہوئی آنکھوں کو خواب دیتے رہے

سکھا رہے تھے جو تہذیبِ بندگی ہم کو
ہم ان کو زہد کا سارا نصاب دیتے رہے

جنہوں نے بخشے تھے کانٹے ہمارے جیون کو
ہم ان کی راہ میں چن کر گلاب دیتے رہے

بچا کے کچھ نہ رکھا ہم نے اپنی جھولی میں
خطائے یار پہ اس کو ثواب دیتے رہے

کچھ اس طرح ہمیں الجھایا زندگی نے رضا
سوال بھول گئے ہم جواب دیتے رہے

سید فرخ رضا ترمذی

غزل

انوار انجم

دل تباہ جو خنداں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خزاں میں رنگ بہاراں نہیں تو کُچھ بھی نہیں

وہ دل جو نام محبت پہ مسکراتا ہے
حریف گردش دوراں نہیں تو کُچھ بھی نہیں

یہ کرب وآہ کی دنیا عجیب دنیا ہے
اگر حیات غزل خواں نہیں تو کُچھ بھی نہیں

جہاں کی خاک جو چھانے کوئی تو کیا حاصل
طواف کوچۂ جاناں نہیں تو کُچھ بھی نہیں

زمانہ لاکھ ترقی کیا کرے انجم
دلوں میں عظمت انساں نہیں تو کُچھ بھی نہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا ، تجھ پہ کُھلا ، یا ، نہ کُھلا میں

غزل

یہ لہجہ تُو نے کیا بدلا ہوا ہے
غزل کا ذائقہ بدلا ہوا ہے

فضا کے رنگ بھی بدلے ہوئے ہیں
دوپٹہ تُو نے کیا بدلا ہوا ہے

ہوا بدلی نہیں ہے اس چمن کی
فقط رنگِ ہوا بدلا ہوا ہے

گواہوں نے بیاں بدلا ہے ایسا
کہ سارا واقعہ بدلا ہوا ہے

مرا تو راستہ اب تک وہی ہے
تمھارا راستہ بدلا ہوا ہے

سمندر بھی سفینہ بھی وہی ہے
بس اپنا ناخدا بدلا ہوا ہے

تغیر اک جگہ موقوف کب ہے
زمانہ ہر جگہ بدلا ہوا ہے

اب اس دنیا میں لگتا ہے کہ سب کچھ
ترے میرے سوا بدلا ہوا ہے

کہیں کچھ بھی نہیں بدلا ہے قیصر
کہیں پر کیا سے کیا بدلا ہوا ہے

قیصر مسعود

غزل

میتھیو محسن

کیسا دل کو سرور ملتا ہے
جب ترے غم کا نور ملتا ہے

ہر تکبر پہ مسکرانے سے
اک مقدس غرور ملتا ہے

تیرہ بختو کوئی بھی ظلمت ہو
ایک سورج ضرور ملتا ہے

سیدھی راہوں پہ چلنے والوں کو
کب جہاں کا شعور ملتا ہے

توبہ ہر بار ٹوٹ جاتی ہے
یہی اپنا قصور ملتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

غزل

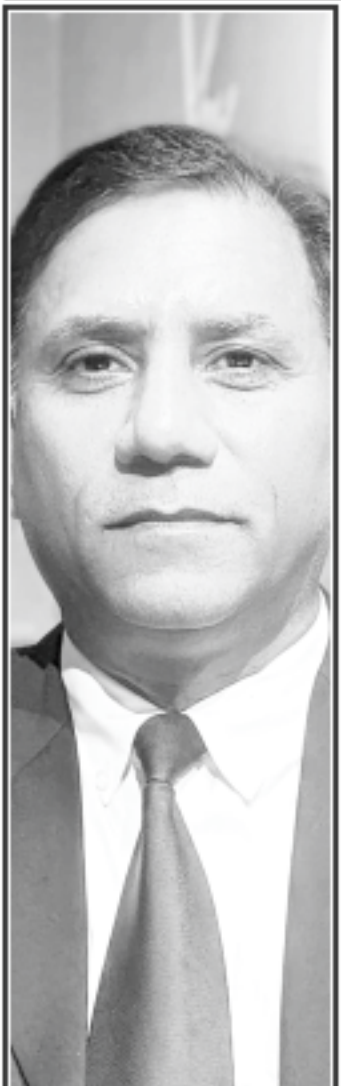

جُدا ہو کے مجھ سے جُدا تو نہیں
جو چاہا تھا تم نے ہُوا تو نہیں

مجھے جس طرح آپ آ کے ملے
فلک یوں زمیں سے مِلا تو نہیں

جُھکے جا رہے ہو جو تعظیم میں
وہ اِنساں ہے آخر خُدا تو نہیں

یہ چشمِ تمنا جو بوجھل ہوئی
کوئی خواب دیکھو دھرا تو نہیں

چراغوں پہ اُن کے بھروسہ کِیا
دیا ایک بھی وہ جَلا تو نہیں

اماوس کے جیسے یہ دن آ گئے
کہ مانگی یہ ہم نے دُعا تو نہیں

تری آنکھ کے لوگ شیدائی ہیں
یہ جادو بھی مجھ پہ چلا تو نہیں

محمد دلشاد رانا

غزل

حسنین سحر

مدحِ جاناں میں کیا کمی کی جائے
وہ تو ایسا ہے شاعری کی جائے

زندگی بے سبب طویل سہی
کیا برا ہے جو دو گھڑی کی جائے

جان تو شے ہی آنی جانی ہے
اس میں کیا جان آدمی کی جائے

کیا سنہرا اصول ہے ان کا
ان کہی بات ان سنی کی جائے

عرصۂ کار زار ڈھونڈ کوئی
نئے لوگوں سے دوستی کی جائے

اُٹھ گیا کون اس سے قطع نظر
برمحل ہے کہ روشنی کی جائے

کہتے ہیں ڈھونڈنے سے ملتا ہے وہ
کیوں نہ یہ سعی واقعی کی جائے

غزل

اسی لیے تو بڑی سخت جان ہوگئی ہے
پڑے پڑے مری مٹی چٹان ہوگئی ہے

دکھوں نے تنگ کیا ہے مزید گھیرے کو
کہ نسلِ نو بھی ہماری جوان ہوگئی ہے

لگا ہوا ہے فلک ہاتھ پاؤں مارنے میں
زمیں زمین نہیں آسمان ہوگئی ہے

نظر کے سامنے آثار ہیں قیامت کے
خدا پہ خلقِ خدا مہربان ہوگئی ہے

یہی پہ ہونے لگا رات دن حساب کتاب
یہ زندگی بھی کوئی امتحان ہوگئی ہے

ہم اہلِ دل ہیں زباں سے مکر نہیں سکتے
سنو ہماری تمہاری زبان ہوگئی ہے

ادھر ادھر کی ہمیشہ اڑاتے رہتے ہیں
قفس نشینوں کی اونچی اڑان ہوگئی ہے

تو آئینے میں کوئی بال آ گیا ہوگا
وہ آئینے سے اگر بدگمان ہوگئی ہے

یہ دل کا حال نظر سے بیاں نہیں ہوتا
تبھی تو سوکھ کے کانٹا زبان ہوگئی ہے

مسعود احمد

غزل

لوگ کہتے ہیں یونہی تیر چلانے سے ہوا
قتل سردار کا دستار اڑانے سے ہوا

پہلے پہلے تو فقط ایک مکاں تھا گھر بھی
کوئی آباد جہاں پیڑ لگانے سے ہوا

بزم میں رنج کا ماحول کہاں تھا ایسے
رنگ یہ ایک عزادار کے آنے سے ہوا

خیر کی بات نہیں خیر بتانی تو ہے
خیر کا کام کہاں میرے زمانے سے ہوا

کیا خوشی اور غمی کیا ہے تری دنیا میں
غم کا احساس مجھے عید منانے سے ہوا

ایک مجمع سا لگا رہتا تھا خوابوں میں مرے
میں اکیلا تو تجھے خواب سنانے سے ہوا

دسترس سے کوئی کس وقت نکل جائے قمر
حوصلہ دل کو پتنگوں کے اڑانے سے ہوا

قمر نیاز

غزلیں

تمھارے ہجر کو واحد خوشی بناتے ہوئے
حیات ختم ہوئی زندگی بناتے ہوئے
کرے گا کھل کے زمیں پر فساد و خوں ریزی
خدا کو علم تھا یہ آدمی بناتے ہوئے
ہمارے دل میں دبی سسکیاں بتاتی ہیں
خوشی تیاگ دی افسردگی بناتے ہوئے
پھر اپنے آپ سے میں عمر بھر نہیں بولا
ذرا سا شور ہوا خامشی بناتے ہوئے
فراق یار میں شاید یہ کام آوے گی
بنانے والے نے سوچا گھڑی بناتے ہوئے

طاہر ناصر علی

جو ہم نے بات کہی غور سے وہ سُنیے گا
جو دل پہ بیت رہی ہے ضرور لکھیے گا
ابھی ہماری طرف آپ کا بھی دھیان نہیں
بچھڑ بھی سکتے ہیں بس اتنا دھیان رکھیے گا
ہم اپنے ہجر کی پھر داستان سنائیں گے
ہمارے ساتھ کبھی دو قدم تو چلیے گا
ہمارے بعد اگر وصل یاد آ جائے
تو اُس کے پھیکے سے خاکے میں رنگ بھریے گا
جو ہم نے غور سے دیکھا ، ہمارا اپنا تھا
جس اجنبی نے کہا میری بات سُنیے گا

تلاش کرتے ہو کیا روشنی کے ملبے سے
بجھے چراغ سے اب تیرگی بناتے ہوئے
یہ کیا ہوا ہے اچانک سے اِس مصور کو
وہ رو پڑا ہے تمھاری ہنسی بناتے ہوئے
شب فراق میں طاہر ہمارے دل کے ساتھ
دیا بھی گھٹتا گیا روشنی بناتے ہوئے

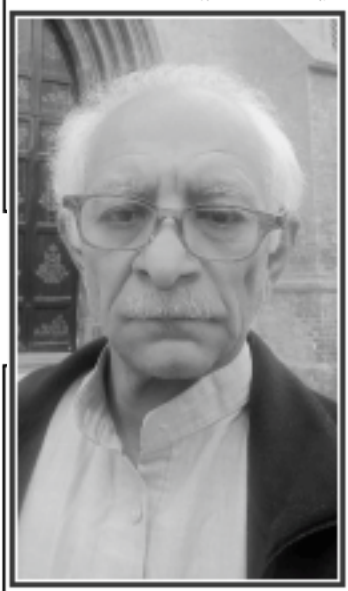

یہ بے زباں ہیں بڑی بددعائیں دیتے ہیں
نہ اِن پرندوں کو پنجرے میں قید رکھیے گا
ہماری یاد گھٹائے گی راہ کی وحشت
سو ہر سفر میں اُسے ساتھ لے کے چلیے گا
ہے کوئی کیسا کسی کو خبر نہیں طاہر
اب احتیاط سے ہی ہر کسی سے ملیے گا

غزل

جب سے لڑنے لگا ضمیر کے ساتھ
جڑ گیا ہوں میں دستگیر کے ساتھ

صلح کا آخری پیام دیا
میں نے تلوار رکھ کے تیر کے ساتھ

پانیوں سا مزاج رکھتا ہوں
جانے کیا ہے مرے خمیر کے ساتھ

ایک بچے کا عکس ہے مجھ میں
بیٹھ جاتا ہوں میں شریر کے ساتھ

منزلوں کا پتہ ملا ہے مجھے
گفتگو کرکے راہگیر کے ساتھ

مجھ کو آخر دھمال ڈالنی ہے
مسکراتے ہوئے فقیر کے ساتھ

شاہ کو اپنا سر جھکانا پڑا
جب سے خلقت ہوئی اسیر کے ساتھ

یوں بھی کوتاہ قد بڑھاتے رہے
جا کے بیٹھے رہے شہیر کے ساتھ

اپنے اندر بھی جھانک سکتا ہوں
مل کے آیا ہوں میں بصیر کے ساتھ

تیرا انداز مختلف ہے نوید
تو ہے غالب کے اور نہ میر کے ساتھ

محمد نوید مرزا

غزل

جب بھی پابندِ ریا بولتا ہے
لفظ معنی سے جدا بولتا ہے

صرف آلام سنا سکتے ہیں
وقت انسان سے کیا بولتا ہے

لوگ محبوب سمجھ لیتے ہیں
میرے اندر کا خلا بولتا ہے

اٹھ کے چل پڑتا ہوں اپنے گھر کو
جب بھی مغلوبِ انا بولتا ہے

بھرے بازار میں سمجھے نہ کوئی
جو بھی زنجیر بپا بولتا ہے

لوگ مشتاق ہیں سننے کے لیے
کیسے راضی بہ رضا بولتا ہے

چھیننے والوں کے شور و غل میں
کب سزاوارِ عطا بولتا ہے

سوز والے ہی بتا سکتے ہیں
رات بھر جیسے دیا بولتا ہے

ہر کوئی سن نہیں سکتا جاذب
خامشی ہو تو خدا بولتا ہے

اکرم جاذب

غزل

یہ کیسا غضب تم کیے جا رہے ہو
کہ دل جو ہمارا لیے جا رہے ہو

حمایت ہے ظالم کے حق میں تمھاری
لبوں کو جو اپنے سئے جا رہے ہو

نظر تم کو آتا نہیں در پہ تالا؟
جو دستک پہ دستک دیئے جا رہے ہو

وفا ہی وفا ہم تمھارے لیے ہیں
جفا ہی جفا تم کیے جا رہے ہو

حقیقت کھلے کس طرح تم پہ یارو
کہ خوابوں میں تم تو جئے جا رہے ہو

ہمیں جام سے دور رہنے کا فتویٰ
مگر خود لہو تک پیے جا رہے ہو

ضرورت ہے جن کو کتاب و قلم کی
انہیں تم تو کاسہ دیئے جا رہے ہو

جسے بھول جانا ہی بہتر ہے پیارے
وہی بات پھر تم کئے جا رہے ہو

بڑا حوصلہ ہے تمھارا جو افضل
سلگتی فضا میں جئے جا رہے ہو

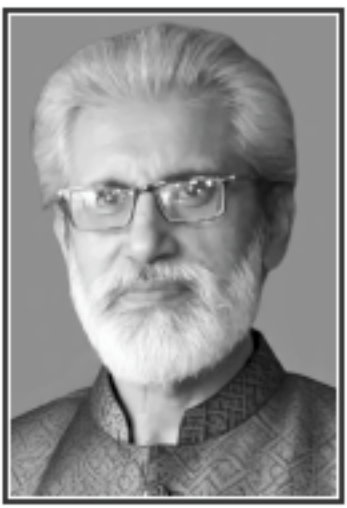

افضل ہزاروی

غزلیں

آسماں سارا دھو دیا گیا ہے
شہر سارا ڈبو دیا گیا ہے

جابجا تیرتی ہوئی لاشیں
سانحہ کیوں سمو دیا گیا ہے

پیاسے بچوں نے بھوک کھالی ہے
کیا یہ کافی ہے جو دیا گیا ہے

اتنی امداد کیا یہ کافی نہیں
بات سن لی ہے رو دیا گیا ہے

وہ جو پایا تھا کب ملا عرفی
جو نہیں پایا کھو دیا گیا ہے

سمیع اللہ عرفی

خیال میں جو قید تھا وہ دھیان سے نکل گیا
مرے غرور سے وہ میرے مان سے نکل گیا

وہ سانس تھا یا روح تھی یہ فیصلہ نہ ہو سکا
جو جسم سے نکل گیا جو جان سے نکل گیا

میں بھید اپنی ذات کے قریب تھا کہ کھول دوں
ریاضتوں کے درمیاں وہ گیان سے نکل گیا

میں اس کے بھاؤ تاؤ میں الجھ گیا تھا اسقدر
وہ اپنا آپ بیچ کر دکان سے نکل گیا

عجیب شخص تھا وہ دشمنوں کے عرفی روپ میں
جو دھوپ لے کے میرے سائبان سے نکل گیا

غزل

یہ جو سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں
ہم جہاں دیدہ ہوئے جاتے ہیں

تم نے جھانکا ہے ہمارے دل میں
لمحے خوابیدہ ہوئے جاتے ہیں

تم کیے جاتے ہو گرویدہ ہمیں
ہم بھی گرویدہ ہوئے جاتے ہیں

کیا کہا پھر سے تو کہنا صاحب
ہم پسندیدہ ہوئے جاتے ہیں

بات ہوتی ہے خوشی کی لیکن
ہم ہی نم دیدہ ہوئے جاتے ہیں

آنکھ کی ممٹی پہ رکھے رکھے
خواب بوسیدہ ہوئے جاتے ہیں

عمر بھر کے یہ سنبھالے ہوئے لوگ
کیسے پوشیدہ ہوئے جاتے ہیں

الماس شبی

غزلیں

میں جو تقدیر کا قائل نہیں ہونے والا
سنگ بھی راہ میں حائل نہیں ہونے والا

اب تو پسپائی پہ روتا ہے مگر دیکھنا تم
اپنے مطلوب کے قابل نہیں ہونے والا

ڈھونڈ کے لاتے رہیں جتنے بھی تریاق مگر
اب اثر زہر کا زائل نہیں ہونے والا

صرف بہتا ہے جو جذبات کی رو میں ہر وقت
وہ تو پابندِ دلائل نہیں ہونے والا

جب ہر اک چیز بنا مانگے میسر ہو ولی
شہر میں کوئی بھی سائل نہیں ہونے والا

شاہ روم خان ولی

پھولوں سے جس کی چاہ کا آنگن نہیں بھرا
سمجھیں زرِ خلوص سے دامن نہیں بھرا

یارا محبتوں کو جدا سیم و زر سے رکھ
یہ سوچ کر کہ دل میں کوئی دھن نہیں بھرا

کہتے ہیں اس کو شومیِ قسمت تو کیا عجب
میں لٹ گیا اور آپ کا دامن نہیں بھرا

کیا خاک بانٹتی ہیں جہاں میں محبتیں
تجھ سے تو میرے دل کا نشیمن نہیں بھرا

دنیا جہاں کے دل میں سجائے گئے ہیں رنگ
جذبات کے بغیر یہ مسکن نہیں بھرا

میں اس کے انتظار میں گم صم رہا ولی
پھولوں کے ساتھ دامنِ گلشن نہیں بھرا

غزل

یاد کے رنگ بھرنے والے ہیں
ہجر کے دن گزرنے والے ہیں

وہ جو بھٹکے ہوئے پرندے تھے
میری چھت پر اُترنے والے ہیں

خود کو یوں ہارنے کا مطلب ہے
اُس کو تسخیر کرنے والے ہیں

ہو رہی ہے امید کی بارش
خشک تالاب بھرنے والے ہیں

اِتنے سمٹے ہوئے جو رہتے ہیں
درحقیقت بکھرنے والے ہیں

زندگی بوجھ بن گئی ہے ظہور
جن کو جینا تھا مرنے والے ہیں

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو ٹھہرے دیوانے بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالد پاگلوں کو گھیرے ہیں

غزل

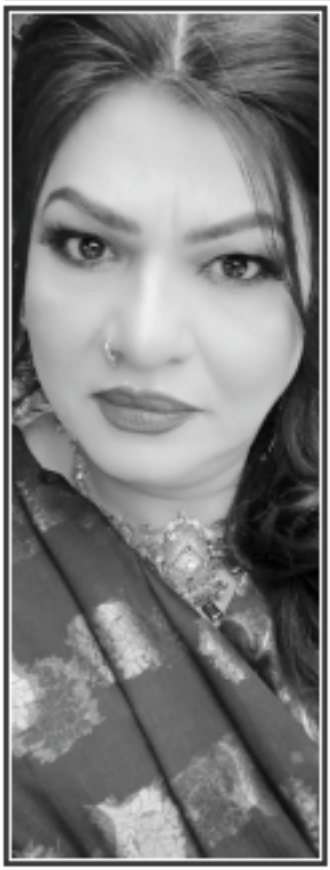

فن کی معراج پہ آتی ہوں تو رو دیتی ہوں
زخم کو پھول بناتی ہوں تو رو دیتی ہوں

جن کی لو میں ہے تری یاد کا منظر روشن
ان چراغوں کو بجھاتی ہوں تو رو دیتی ہوں

آگے بڑھتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ سکتی جب
سوئیاں الٹی گھماتی ہوں تو رو دیتی ہوں

کون سمجھے گا مرا بزم سے خلوت کا سفر
جب کبھی ہنستی ہنساتی ہوں تو رو دیتی ہوں

اپنا کہتے ہوئے وحشت سی مجھے ہوتی ہے
اور اگر غیر بتاتی ہوں تو رو دیتی ہوں

وہ جیا جو کہ جیا کرتی تھی پورے ڈھب سے
جب اسے سامنے لاتی ہوں تو رو دیتی ہوں

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ شام چاند تھا خالد تو صبح سورج تھا
مرے فلک سے نہ اُترا فراق کا تارا

غزل

محبت اک شعوری تجربہ ہے
مبارکباد تو سب دے رہے ہو

نہ ہو جو ختم یہ وہ سلسلہ ہے
یہ دل کو گھیرے کیسا وسوسہ ہے

تمہیں کھو کر مکمل پا لیا ہے
نجانے ڈھونڈتی ہیں کس کو آنکھیں

تمہارے عشق کا ہی معجزہ ہے
نجانے کون ہے جو لاپتہ ہے

وہی موسم وہی پیہم اداسی
عداوت کو نبھایا جیسے اس نے

جسے دیکھو وہ لگتا دل زدہ ہے
مرا دل آج تک حیرت زدہ ہے

تمہاری ضد نبھا کر دیکھتے ہیں
نہیں ملنا یہی اب فیصلہ ہے

نیا کچھ بھی نہیں اے سال تم میں
نئی منزل گزشتہ راستہ ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

غزل

تم کیا گئے کہ شہر کا موسم بدل گیا
چاہت کا الفتوں کا ہے عالم بدل گیا

موسم بدلتے رہتے ہیں موسم سے کیا گلہ
وہ دیکھتے ہی دیکھتے پیہم بدل گیا

پہلے نہ اپنے حال پہ رویا تھا میں کبھی
اب کے تو اپنا گریہ و ماتم بدل گیا

تیر نظر سے جس کے تو کوئی نہ بچ سکا
کہتے ہیں لوگ کتنا وہ ظالم بدل گیا

قصے سنے تھے جس کی سخاوت کے بے شمار
کیسا ہے اب یہ دور کہ ''حاتم'' بدل گیا

کس کو سنائیں کس سے کہیں جا کے حال دل
اشفاق تھا جو تیرا وہ ہمدم بدل گیا

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یار کس آن بان سے، گزرے تھے اپنی جان سے
مُردے گڑے، اُکھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

غزل

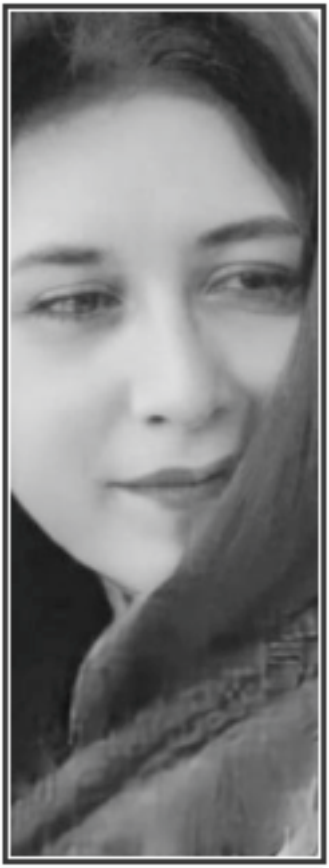

جب تلک یہ مری خوش گمانی چلی
تب تلک میرے دل کی روانی چلی

چل پڑی ہوں میں چپ چاپ ہی اس طرف
جس طرف بھی مری زندگانی چلی

چھوڑ بابل کا گھر، اب تو پی کے نگر
آج رو رو کے ہے گھر کی رانی چلی

قصے پہلے زمانے کے، اب ہیں کہاں
ہر طرف ہے نئی، اک کہانی چلی

چھوڑ کوکی! تو منزل کی باتیں نہ کر
تیری کشتی تو ہے ، بادبانی چلی

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے دامنِ نگاہ! وہ دھبّا نہیں رہا
اِس دشت میں اِک آبلہ پا تھا ،نہیں رہا

غزل

جب سے ہوش سنبھالا دل نے
ایک ہی غم ہے پالا دل نے

ہر اک دکھ کا درد ہے اپنا
ہر دکھ دیکھا بھالا دل نے

خون کے آنسو بہہ نکلے ہیں
پھوڑا غم کا چھالا دل نے

کیوں ، کب ، کیسے ، کتنے کا بھی
ذہن سے دھویا جالا دل نے

ماضی کا گُم گشتہ لمحہ
پھر سے ڈھونڈھ نکالا دل نے

اُس کے دل پر چوٹ لگا دی
ہائے کیا کر ڈالا دل نے

اُس چہرے کے چاروں جانب
دیکھا نور کا ہالہ دل نے

جیسے پیا سقراط نے ویسے
پیا ہے پریم پیالہ دل نے

راجہ عبدالقیوم

غزل

خواہش کے بانکپن کو نہ بازار سے نکال
خوشیوں کو بلکہ چشمِ خریدار سے نکال

میدان کے رواج کو تبدیل کر کے دیکھ
اور خوئے انتقام کو تلوار سے نکال

منزل ترے ہی نام سے تجھ کو پکارے گی
پہلے قباحتوں کو تو اسفار سے نکال

لہجہ بدل کے آج صفِ دشمناں میں آ
کچھ خیر خواہ مجمعِ اغیار سے نکال

کب سے پڑی ہوئی ہیں ترے انتظار میں
اب حسرتوں کو حجرۂ بیمار سے نکال

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مقدور سے کچھ بڑھ کے تو مجبور نہ تھا میں
یہ شکر کی منزل تھی ، سو خاموش رہا میں

غزل

مری وحشتوں میں ذرا کمی نہیں ہو رہی
کوئی سانس بھی مری آخری نہیں ہو رہی

مجھے اپنا ہونا بھی زہر لگتا ہے کیا کروں
مری اپنے آپ سے دوستی نہیں ہو رہی

مری وحشتوں پہ عروج تھا تو سکون تھا
مگر اب سکون میں شاعری نہیں ہو رہی

کوئی شوق تھا وہ جو لے گیا مجھے دشت تک
ابھی چاہتی ہوں تو واپسی نہیں ہو رہی

مجھے کیا خبر یہ عروج ہے کہ زوال ہے
مجھے تجھ سے مل کے کوئی خوشی نہیں ہو رہی

کوئی شکل کیسے بنے مری، ابھی خام ہوں
ترے چاک پر مری واپسی نہیں ہو رہی

کوئی بات ہے جو وہ بدگمان ہیں آج کل
مجھے کیا پتہ مری بات ہی نہیں ہو رہی

کئی زخم تھے جو کرید کر ہرے کر دیے
یہ جو شاعری ہے ہنسی خوشی نہیں ہو رہی

وہ جو دوستی تھی شدید تر، وہ نہیں رہی
یہ بھی کم ہے کیا ابھی دشمنی نہیں ہو رہی

یہی مسئلہ سبھی مسئلوں کا سبب بنا
کوئی گفتگو ہے جو باہمی نہیں ہو رہی

شمع ملک

غزل

سید ظہیر کاظمی

تمام شہر کھنگالا گیا ، مگر نہ ملا
تمھارے بعد کوئی ایسا ایک در نہ ملا

وہ ایک خواب جو بکھرا پڑا ہے چاروں طرف
اس ایک خواب کا مجھ پر کہیں اثر نہ ملا

ہم اپنے درد سنبھالے پھرے مگر اس نے
کچھ ایسا سحر کیا کوئی نامہ بر نہ ملا

یہ کائنات ہمیں دی گئی تھی عجلت میں
خراب و خوار پھرے ، ہم کو ایک گھر نہ ملا

ہم اپنے خواب سنبھالے نکل پڑے ہیں ظہیر
یہ اور بات کہیں کوئی ہم نظر نہ ملا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

ہر گام اپنے ہاتھ میں جب آئنہ رہا
اک جھوٹ کا پجاری تو یکسر خفا رہا

پھر وسوسے نگل گئے میرے وجود کو
جب تک تمھارے ساتھ رہا، میں بچا رہا

کہتے ہیں لوگ زخمی تھی خود اس کی پور پور
جو میرے راستے میں تھا کانٹے بچھا رہا

مفلس کی زندگی بھی کیا، جس کے مکان پر
کتبہ ضرورتوں کا ہمہ دم لگا رہا

در پے ہیں آج کاٹنے کو وہ شجر بھی لوگ
جو آندھیوں کے مدِ مقابل کھڑا رہا

مالک تری تلاش میں تاخیر یوں ہوئی
اک عرصہ اپنے آپ کو میں ڈھونڈتا رہا

وہ اشک بن کے آج عیاں ہو گیا نوید
اک غم جو عرصہ تک مرے دل میں چھپا رہا

نوید عاجز

غزل

وقت نے یوں پلٹ کے وار کیا
میرے سینے کو داغدار کیا

جس نے دھوکہ دیا مجھے میں نے
اپنے سر پر اسے سوار کیا

جب مرا حوصلہ بلند ہوا
سارے عالم کو سوگوار کیا

دل کے ہر زخم نے گواہی دی
درد نے مجھ کو باوقار کیا

آئنہ دیکھنے کے بعد ندیم
اس پری وش نے شرمسار کیا

ندیم ملک

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نقشِ طلب ربط سر و سنگ ہے
قطرۂ خوں ، خانۂ ارژنگ ہے

''رات کی راہداری میں'' کچھ سانس

عام طور پر شاعروں کے دوسرے مجموعے کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پہلے مجموعے سے آگے کے سفر کا تاثر ابھارنا تو کجا اپنے اولین مجموعے والا تاثر بھی برقرار نہیں رکھ پاتے۔ فکر وفنی لحاظ سے پہلے مجموعے والے تاثر تک رسائی میں ناکامی تو سراسر شاعر کے لیے لمحہ فکریہ ہوتا ہے مگر بہت کچھ نئے کی توقع خود شاعر کے ساتھ ناانصافی والی بات ہوگی۔ کیوں کہ کسی بھی اصیل شاعر کا پہلی بار سامنے آنا سمندر میں ایک نئے جزیرے کے دریافت ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ قاری پہلی بار اس کے منفرد عجائبات سے روشناس ہو رہا ہوتا ہے، جن کے حصے کی حیرت کا جاگنا فطری ہے۔ اب اسی جزیرے کی سیرِ مکرر میں کچھ نہ کچھ نیا تو ضرور ہوگا مگر اس نئے کی مقدار جزیرے کی سیرِ اول جتنی تو نہیں ہو سکتی۔ اب قاری چونکہ شاعر کے پہلے مجموعے کے رنگ و آہنگ سے مانوس ہوتا ہے اس لیے پہلے مجموعے کا سا استعجاب محسوس نہیں کر پاتا، اور شاعر کی ارتقائی مسافت بارے کسری التباس کا شکار ہو جاتا ہے۔ انصاف یہ ہوگا کہ دیکھا جائے کہ شاعر نے اپنی فکری وفنی سطح برقرار رکھتے ہوئے دونوں پہلوؤں سے کوئی آگے کا سفر بھی کیا ہے یا نہیں۔ اگر بے ساختگی مجروح ہوئے بغیر فن میں کوئی نکھار پیدا ہوا ہو اور فکر و خیال میں بھی تکرار کا تاثر نہ ابھرے اور کچھ نئے معنیاتی عکس و آثار بیدار ہوتے دکھائی دے جائیں تو یقیناً یہ شاعر کے اگلے قابلِ قدر اور بامعنی شعری سفر کی گواہی ہوگی زیرِ نظر شعری مجموعے ''رات کی راہداری میں'' کا اصیل شاعر سجاد بلوچ چونکہ اس عرصہ ہجر کا مسافر ہے جس میں ہر قدم کے ساتھ دوری منزل اور بھی نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے اس کے ہاں اسرار کا تسلسل تکرار کا امکان

جلیل عالی

پیدا ہی نہیں ہونے دیتا۔ وقت کے ساتھ اس کے اظہار و بیان کی شائستگی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آپ اس کے درج ذیل اشعار پڑھیں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ بھی بڑی حد تک مجھ سے اتفاق کریں گے۔

اگر کسی نے خریدا نہ آج بھی مرا دن
تو معذرت مرے لیل و نہار تھک گیا میں

.....

تو اتنے آئنوں کے سامنے کیوں خوار ہوتا ہے
ہمیں مل، ہم تری آنکھوں کی حیرانی سمجھتے ہیں

قیامت واقعی کوئی مری بستی پہ گزری ہے
جو زندہ بچ گئے ہیں خود کو لافانی سمجھتے ہیں

.....

بے رخی وقت نے برتی ہے کچھ ایسی مرے ساتھ
کبھی بے سمت ہوں میں اور کبھی سمت نہیں

.....

کتنا کمزور سمجھتا تھا میں خود کو لیکن
شہر کا شہر لگا ہے مری مسماری میں

چند بچے کسی تتلی کے تعاقب میں ہیں
شہر سارا ہے مگن جنگ کی تیاری میں

.....

کل اس جگہ پہ ہوا راکھ اڑا رہی ہو گی
ہمارے بیچ یہ جلتا الاؤ آخری ہے

.....

لوگ کر لیتے ہیں اوروں کا سخن اپنے نام
شرم آتی ہے ہمیں خود کو بھی دہرانے میں

ہر مسافر پہ ہمیں تیرا گماں ہوتا ہے
گرد کے ساتھ کئی بار ہیں اٹھے بیٹھے

.....

کس طرح بھلا ملتے، چل رہے تھے مدت سے
ایک رہگزر پر ہم، دو الگ زمانوں میں

.....

یہ جو آزاد سا پھرتا ہوں اسیری میں بھی
مجھے زنجیر کی لمبائی کا اندازہ ہے

.....

تو من و تو میں جو پڑتا ہے تو میں بنتا ہوں
میں من و تو سے نکلتا ہوں تو تو بنتا ہے

.....

ساحل پہ کس نے کھولے ہیں بازو مرے لیے
طوفاں لپٹ گیا ہے مرے بادبان سے

.....

مرے سکوت نے مجھ کو سمیٹ رکھا تھا
تجھے پکار کے پھر فرد فرد ہو گیا ہوں

.....

ہم اگر ہو گئے خاموش تو سو جائیں گے
سو گئے ہم تو تو ہمیں رات نگل جائے گی

.....

کچھ روایات ہیں تماشوں کی
کچھ روایات کا تماشا ہے

.....

ذرا سے پھل کے لیے شاخ کاٹ لی تم نے
یہ بھوک کی تو علامت نہیں ہوس کی ہے

☆☆☆☆☆

آغازِ عہدِ بہمنی کی سیاسی و ادبی صورت حال

بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء-۱۵۲۷ء) کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب محمد بن تغلق کے زمانے میں پایۂ تخت دِلّی سے دولت آباد منتقل کیے جانے کے باوجود ۱۳۴۶ء میں امیرانِ صدہ نے سلطان محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کر کے ناصر الدین اسماعیل شاہ کو دولت آباد کا حکمران منتخب کر لیا تاہم ظفر خان کی فتوحات دیکھتے ہُوئے اسماعیل مخ اپنے بڑھاپے کا عذر بنا کر دستبردار ہو گیا اور دکنی امرأ نے اگست ۱۳۴۷ء میں ظفر خان کو تاج پہنا دیا۔ ظفر خان کی تاجپوشی علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی شاہ کے لقب سے دولت آباد میں ہُوئی جو مرکز سے علیحدہ آزاد بہمنی سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہُوئی۔ بادشاہ نے دولت آباد سے ۱۸۸ میل دُور کلبرگی (گلبرگہ کا قدیم نام) کا نام حسن آباد رکھ کر اسے اپنا پایۂ تخت مقرر کیا۔ اقتدار کی منتقلی کے بعد اگرچہ اسماعیل شاہ کو گوشہ نشین ہونا پڑا لیکن حسن گنگو نے اسے جمکھندی کے قریب ایک جاگیر دی اور بعد میں سلطنت کے اعلیٰ ترین لقب امیر الامرأ سے نوازا۔

عبدالملک عصامی کہتے ہیں کہ حسن گنگو اصلاً غزنی سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے تین بھائیوں کے ساتھ محمد بن تغلق کی خدمت میں داخل ہُوا۔ اُن سب کو دکن میں چھوٹی چھوٹی جاگیریں دی گئیں۔ حسن کو بھی کنجی نامی قصبہ مِلا۔ حسن کے بڑے بھائی علی نے دیگر بھائیوں کے ساتھ مِل کر سلطان محمد بن تغلق کے خلاف سازش کی اور خود کو سلطان علاؤ الدین علی ملک شاہ قرار دیا لیکن شکست ہُوئی اور دو بھائیوں احمد اور محمد کے ساتھ سلطان محمد بن تغلق کے پاس لے جایا گیا جس نے اُنھیں جلا وطن کر کے غزنی بھیجا اور آخر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دکن

خاور اعجاز

میں باقی بچ جانے والے حسن نے بغاوت کے لیڈر ملک اسماعیل مخ کی فوج میں شمولیت اختیار کی لیکن دولت آباد کی لڑائی میں باغیوں کو شکست ہُوئی۔ حسن گنگو گلبرگہ کے قلعہ کی طرف پیچھے ہٹ گیا جہاں ۳ اگست ۱۳۴۷ء کو اس نے شیخ رکن الدین المعروف شیخ محمد سراج الدین محمد جنیدی کی سرپرستی میں علاؤ الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے بادشاہت کا اعلان کیا۔

شیخ محمد سراج الدین محمد جنیدی (۱۲۷۱ء-۱۳۸۰ء) المعروف شیخِ دکن، سلسلۂ چشتیہ اور جنیدیہ کے جلیل القدر صوفی بزرگ تھے اور دکن کے سب سے بڑے روحانی پیشوا مانے جاتے تھے۔ آپ کا اسمِ گرامی دولت آباد (دیوگری) تشریف لانے والے مشائخ میں قابلِ ذکر ہے۔ آپ بہمنی دور کے عظیم بزرگ تھے جن کا سلسلۂ نسب ۱۲ ویں پشت میں جنید بغدادی سے ملتا ہے۔ بہمنی سلطنت میں اپنے اثر ورسوخ نیز روحانی اور سیاسی مرتبہ کے لحاظ سے نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ سلطنت کے بانی علاؤ الدین حسن بہمنی آپ کے خاص مرید تھے۔ آپ کے ہاتھوں پانچ بہمنی بادشاہوں کی تاجپوشی عمل میں آئی۔

بہمنی سلطنت کے حکمران شمالی برِصغیر سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ مقامی تھے۔ بہمنی دور کی ادبی تخلیقات میں ادبا و شعرا کے ساتھ ساتھ صوفیا کرام کا بڑا حصہ ہے جنھوں نے اپنی نثری اور شعری تحریروں میں دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مطلوب رکھی لہٰذا اُس زمانے کے ہدایت نامے اور پند نامے اشاعتِ مذہب کے علاوہ دُنیاوی اخلاقیات کا درس بھی دیتے ہیں۔ اُن بزرگوں اور صوفیا نے تو اپنی تحاریر تبلیغی مقاصد کے لیے وقف کیں لیکن اُن کی یہ کاوشیں وقت گذرنے کے ساتھ لسانی حوالوں کے لیے اساسی اہمیت حاصل کر گئیں۔ بہمنی حکمرانوں میں سب سے پہلے بہمن شاہ نے اپنی شناخت و تشخص کو اُجاگر اور الگ کرنے کے لیے فارسی کے مقابلہ میں اردو (اُس زمانہ میں یہ زبان جیسی بھی تھی) کی سرپرستی کر کے اِسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

مسلمان جب دکن میں وارد ہُوئے تو وہ بلحاظ تمدن مقامی مرہٹوں کے مقابلے میں برتر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی زبان (مرہٹی) میں فاتحوں کی زبان (فارسی عربی) کے الفاظ اور محاورے داخل ہونا شروع ہو گئے اور جملوں کی ساخت تک کو متاثر کیا۔ مرہٹی میں اضافت کا استعمال

واضح طور پر فارسی کا اثر تھا۔ فارسی کے بڑھتے ہُوئے اثرات کی بعض اور وجوہات بھی تھیں جیسے مسلمانوں کی آمد کے بعد سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہُوئی تو ملازمت کے متلاشیوں کو اس زبان سے ارتباط پیدا کرنا ناگزیر ہو گیا۔ دوئم درویشوں صوفیا فقرا کے توسط سے عربی فارسی الفاظ نے مقامی افراد کے درمیان افزائش پائی اور سوئم اسلام قبول کر لینے والوں اور ہندو مسلم شادیوں کے باعث کثیر تعداد نے عربی فارسی الفاظ کو ضرورتاً اپنی گفتگو کا حصہ بنایا۔

جنوبی برِصغیر کی بہمنی سلطنت کے لسانی ڈھانچے (مراٹھی، کنڑی، تلنگی) کا پہلا رابطہ محمد بن تغلق کے دولت آباد کو پایۂ تخت کی حیثیت دینے سے شمالی برِصغیر کی تغلق سلطنت کی فارسی زبان سے ہُوا جس کا اثر یہ ہُوا کہ بہمن شاہ کے مورخ خواجہ عبدالملک عصامی کی گلبرگہ میں لکھی جانے والی ''فتوح السلاطین'' کے علاوہ منہاج الدین عثمان المعروف بہ منہاج السراج کی ''طبقات ناصری'' کی ملحقات یا ضمیمہ عین الدین بیجاپوری فارسی ہی میں ہیں

مولانا عبدالملک عصامی (۱۳۱۱ء - ۱۳۵۰ء) معروف عالم، شاعر اور مورخ تھے۔ بہمنی سلطنت کے بانی علاؤ الدین بہمن شاہ کے زمانہ میں ''فتوح السلاطین'' کے نام سے فارسی اشعار پر مشتمل فتحِ دکن کی منظوم تاریخ چند ماہ (۹ دسمبر ۱۳۴۹ء تا ۱۴ مئی ۱۳۵۰ء) میں لکھی جو قیامِ سلطنت، اس کے نظم و نسق اور دیگر اہم واقعات کو دلچسپ پیرائے میں تفصیل و تسلسل سے بیان کرتی ہے اور مبالغہ آرائی نیز محض زور بیان جیسے منفی عناصر سے پاک ہے۔ کتاب میں محمود غزنوی اور محمد غوری سے لے کر بہمنی سلطنت کی ابتدائی فتوحات کا تذکرہ ہے تاہم مثنوی کی طرز پر لکھی گئی یہ کتاب تاریخی حوالوں کے لیے مستند مواد فراہم نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود چودھویں صدی عیسوی کے برِصغیر کے سیاسی و سماجی حالات اور اسلامی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب ۳۳۷ عنوانات کے تحت مختلف حصوں میں منقسم ہے جس کی ابتدا توحیدِ باری تعالیٰ، نعتِ رسول، صفتِ شبِ معراج، مناقبِ خلفائے اربعہ اور سببِ نظم ایک کتاب جیسے موضوعات سے ہوتی ہے۔ توحیدِ باری تعالیٰ کے ابتدائی دو اشعار یوں ہیں:

بہ نامِ خداوندِ ہر دو جہاں
کند ابتدا نامہ کار آگہاں

ہر آں نامہ آغاز ازاں نام شد
در انجام کارش سر انجام شد

.....

بہمنی سلطنت کے قیام سے قبل بھی اس علاقہ میں مراٹھی، کنڑی، اور تلنگی زبانوں کا رواج تھا تاہم بہمنی سلطنت کے ابتدائی ایام میں مراٹھی زبان کی سرگرمیاں ماند پڑنے لگیں اور حسن گنگو کے دربار میں عربی، فارسی اور ترکی کے کئی جید دانشور کی موجودگی میں زبان کا کینڈا تبدیل ہونے لگا۔ اس تبدیلی کے سرخیلوں میں مندرجہ ذیل بزرگوں کی مساعی شامل ہے:

سید شاہ زین الدین داؤد شیرازی (۱۳۰۲ء - ۱۳۶۹ء) دکن کے عظیم صوفی بزرگ اور سلسلہ چشتیہ کے معروف عالم تھے۔ دکنی زبان کے فروغ کے علاوہ تصوف کے شعبہ سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اُن کی مثنوی ''نرلک نامہ'' اور ملفوظات دکنی زبان کے ابتدائی نمونے قرار دیے جاتے ہیں۔ مثنوی نرلک نامہ ۱۳۶۹ء سے قبل دیوگری میں لکھی گئی۔ اس میں صوفیانہ خیالات، توحید اور اخلاقی اقدار کی تعلیم و تلقین کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے ایک مرید میر حسن نے آپ کے ملفوظات کو ''ہدایت القلوب'' نامی کتاب میں جمع کیا ہے۔ دیگر ملفوظات: دلیل السالکین، حبۃ القلوب من مقال المحبوب اور حبۃ المحبۃ کے ناموں سے ہیں۔

''ملحقاتِ ناصری'' کے عنوان سے منہاج الدین عثمان کی کتاب ''طبقاتِ ناصری'' پر لکھا گیا ضمیمہ عین الدین گنج العلوم کی یادگار ہے جس میں طبقاتِ ناصری کے نامکمل اور بعد کے واقعات درج ہیں مگر اس کا اصل مسودہ اَب ناپید ہے - اِس کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو میں ۱۳۰ کے قریب کتابوں رسالوں کے مصنف و مولف ہیں جن کا بہ اعتبارِ موضوع دائرہ تفاسیرِ قرآن، قرأت، حدیث، فقہ، سلوک اور اصولِ قانون سے لے کر فلسفہ، منطق، تاریخ اور صرف ونحو تک پھیلا ہُوا ہے۔ گنج العلوم کے شاگردوں اور خلفاؤں میں شیخ ضیا الدین غزنوی، ابوالبرکات سید شاہ حافظ حسنی، شیخ حسین شیخ وجیہ الدین سنگانی، شیخ ابراہیم سنگانی شیخ عبداللہ غزانی، شاہ حمزہ حسینی، شاہ حبیب اللہ کرمانی، سید علی شہید، شیخ عماد الدین احمد سنگانی، شیخ نصر الدین سنگانی، امام عبداللہ ابوالقاسم غزنوی اور، شیخ مصطفیٰ جنیدی نے آپ کی روشن کی ہُوئی شمع جلائے رکھی اور بہمنی سلطنت کی ادبی روایات کو تادیر زندہ رکھا۔

☆☆☆☆☆

کہانی اگر تفریق ہو جائے

بنا دھاگے کے موتی پرونا یعنی بغیر کہانی کے ماجروں کو ناول کی اکائی مہیا کرنا؛ ایک تجربہ ہی نہیں، چیلنج/ چنوتی ہے۔ اس تکنیک میں بنیادی غلط فہمی یہ ہوئی کہ سمجھا گیا، محض کہانی کو منہا کر دینے سے یہ کرشمہ دکھایا جا سکتا ہے، جبکہ ناول نگار پلاٹ کو Liquify کر کے اس کی بدلی ہوئی ماہیت فراہم کرتا ہے، جس کی جانب عام قاری کا دھیان منتقل نہیں ہو پاتا۔ اس نعم البدل کی خاصیت یہ قرار پائے گی کہ وہ کہانی کی مانند 'ایک' نہیں ہوگا۔ 'سے کا ساحل' کی خالق ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ اس لطیف رمز سے آگاہ ہیں۔ یوں اپنے دونوں ناولوں[1] میں انھوں نے مذکورہ Substitute کو قدرے فرق کے ساتھ برتا چاہا۔ 'زندگی ایک ناراض متن' میں تعلیقات فکشن کی غیر رسمی وحدت کو استوار کرنے میں اپنی ذمہ داری ادا کرتی ہیں جبکہ اس نئے ناول میں وقوعوں کی اکائیاں زیست کے فطری بکھراو سے کمک حاصل کرتی ہیں کہ جینے کے عمل اور مظاہر میں بھی کوئی منطقی ترتیب موثر نہیں، اس کے عکس یعنی فکشن میں بھی حیات ٹکڑوں کی پیش کنندہ ہے۔ کیا ایسا ہونا بجائے خود ایک نوع کی واقعیت نہیں؟ انسلاک کی شعوری کاوش تو سراسر ایک اکتسابی عمل ہوا، کیونکہ نظریہ سازوں نے اپنے فکشن کا کاروبار بہرحال چلانا ہے، وہ اگر ایک مربوط نظام وضع نہیں کریں گے تو اپنا امتیاز، اپنی نرگسیت کیسے قائم کر پائیں گے؟ گرد و پیش کا غیر متعین بہاو میں سدا رواں رہنا ___ بھلوں کے ساتھ اچھا برا سب ہوتے چلے جانا، بروں کے ساتھ بھی یہی

جمیل احمد عدیل

سلوک ___ ہاں ! حشر سے آسرا تو پکڑا جاتا رہا مگر یہ تجرید بھی برابر ملتوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ گویا کوئی قطعی یقینی اصول کارفرما نہیں ملے گا۔ سزا جزا مل بھی جائے گی نہیں بھی ملے گی ۔ کبھی مائیکرو لیول پر ایسی مداخلت کہ سوچنے والا ورطۂ حیرت میں ڈوب جائے، کبھی قیامت خیز واقعات پر ایسی لاتعلقی کہ جیسے کوئی بڑی طاقت نرا وہم ہو!

اس وسیع تناظر کے ہوتے ہوئے کسی خطے کی چھوٹی سی سماجی زندگی کو اتنا سیریس کیسے لیا جا سکتا ہے، جس میں سارے عدل و انصاف اور جملہ معنویتیں جمع ہو کر اسے عظیم ارتباط کا منارہ ثابت کر ڈالیں ! مصنفہ کی دونوں ناولیں بھی چند افراد کو، کچھ وقوعوں کو پیش کرتی ہیں، جنھیں ایک خواندہ اگر جیون کے 'غیر مرتب' منظرنامے سے علاحدہ کر کے دیکھے گا تو الجھن میں پڑ جائے گا۔ اگر وہ جلد ساز کا ممنون ہوئے بغیر زندگی کے ہر ورق کو ایک مکمل پنا سمجھتے ہوئے اس سے لطف کشید کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو یہ فکشن بے شک اس کے کام کی چیز ٹھیرے گی۔ تناقضات سے معمور ان کرداروں سے مل کر اسے اچھا لگے گا اور وہ دل ہی دل میں تائید کرے گا کہ ایسے ہی لوگ تو اسے معاشرے میں ملتے رہے ہیں۔ کبھی اچھے ہو کر، کبھی برے ہو کر۔ اپنے محدود مداروں کو لامحدود گمان کرنے والے سادہ سے افراد، جن کی عیاریاں بھی معصوم تھیں اور جو اپنی سادگیوں میں بھی کائیاں تھے۔ ایسے لوگ ایک وقت میں ہمارے عدو تھے، یہی احباب بنے۔ دوستیاں عداوتوں میں منقلب ہوئیں اور پھر دشمنیوں نے سنگتوں میں ڈھل جانے سے سرور پایا۔ یہ ایک رواں عمل ٹھہرا۔ دراصل یہ ذہنِ انسانی کی درماندگی ہے کہ وہ کسی ایک مرحلے میں مظہریات کو رکی ہوئی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ پیہم تحرک تفہیم کے راستے میں حائل ہوتا آیا ہے۔ اسی لیے موت کو 'فل سٹاپ' فرض کرنا پڑا۔ بلاشبہ بادی النظر میں تسلسل معطل ہو جائے گا لیکن استمرار کا سرفراز سچ حتمی بندش کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ۔ہاں! التوا (Adjournment) ایک واقعہ ضرور ہے۔ اسی طرح اجزا کے مفروضے کارآمد ہوتے رہے یا کارآمد محسوس ہوتے رہے۔ یہ ناول بھی اسی کیفیتِ ظاہری کا عکاس ہے۔ متذکرہ ناول کو پڑھتے ہوئے معاً جانا جا سکے گا کہ کچھ کرداروں کو بعض مقامات پر

مجادلے میں محو بھی دکھایا گیا ہے، جو بادی النظر میں بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنے اپنے موقف کو مطلقیت کے ترجمان سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے مباحثے انجام کار کسی یقینی کلیے پر منتج نہیں ہوتے۔ اس کی بین برہان یہ بنے گی کہ ناول نگار تو کیا راوی بھی ان میں سے کسی کی طرف داری کا روادار نہیں۔ یوں وہ اپنی آزادی کو ہر حال میں بحال رکھتے ہیں۔ وگرنہ ہوتا یہ آیا ہے کہ بعض کہنہ مشق فکشن رائیٹر بھی بڑے جاندار استدلال اور شاندار اسلوب میں علمیت سے مزین مباحث کو متن بنا کر پیش کر دیتے ہیں؛ لیکن سب اس لیے مصنوعی ٹھیرتا ہے کہ اسے سوچا ہوا؛ پہلے سے طے شدہ کہنا پڑے گا کیونکہ مصنف کسی خاص نظریے کا پرچارک؛ کسی خاص عقیدے کا مبلغ ہوتا ہے۔ اس کی یہ فن کاری جلد ہی پکڑی جاتی ہے کہ وہ کرداروں کو کٹھ پتلیاں بنا کر استعمال کرتا ہے۔ زیست کے حقیقی جوہر کو اگر نظر انداز نہ کیا جائے تو شاید یہ گرہ کھل بھی سکتی ہے کہ معمول کے معاملات تحیر کے عناصر کی نفی نہیں کرتے۔ روٹین حیرت کو کب مار سکتی ہے! بھلے ہی وہ پیراڈوکس کو توانا کرے؛ بھلے ہی وہ منضبط ہونے کے یکسر بند تصور کو منہدم کرے؛ ہاں! جیتے مرنے کی بظاہر ایک ٹھگی بندھی صورت حال تو موجود رہی ہے؛ یوں حقیقت نگاری کے عنوان سے اسی فکشن کی تراش ہوتی آئی ہے وگرنہ ایک مرے ہوئے شخص کو فکشن رائیٹر از سرنو زندہ کر کے واپس دنیا میں لے آتا ہے تو قاری اس کا کیا کرے؟ سلسلہ بندی میں واپسی کا عنصر شامل نہیں۔ روانی سدا نیا لائے گی۔ جس میں 'انہونی' کا عنصر موثر ملے گا۔ یہ برا بھی ممکن ہے، بھلا بھی، تاہم بھید اسی سے وابستہ ہے۔ سو، ہو بہو نقل فکشن نہیں - وہ چاہے آمیزے کو فکشن بنائے لیکن مستعار مواد پر انحصار نہ کرے۔ یا آٹے میں نمک برابر! بنا بریں نصائح اور کلیوں کا ترجمان مشاہدہ اس کی تکذیب کیسے کر پائے گا کہ ایک عرصہ اس مسکن کو سرمدی جاننے والے جب تہ خاک چلے گئے تو کسی کو کچھ فرق نہ پڑا۔ زماں کا دریا برابر بہتا رہا۔ بھلا زندگی کو ابتدا انتہا کے منور منطقے نصیب ہوئے ہیں جو کسی فکشن کو آغاز و منتہا کی اعلانیہ قوسین میں اسیر کیا جا سکے؟

شاہدہ شاہ اپنی اپج پر افسانہ/ ناول لکھنے کا عزم رکھتی ہیں - The matic Arehitecture ان کے لیے ماڈل نہیں

رہا۔ پہلے سے موجود موضوع کو سامنے رکھ کر ڈیزائن بنالینا بہرحال آسانی لیے ہوئے ہے۔ یوں مصنفہ کا تعلق خطبے ارشاد فرمانے والے قبیلے سے نہیں؛ جس کے باسیوں کا جاگنا سونا تک ضابطے کے زندان کا قیدی ہوا کرتا ہے؛ اس طرح وہ اپنے اپنے منبر و محراب کو نجات کی اکلوتی عمارت یقین کرنے کی سرشاری میں دن رات جھومتے رہتے ہیں __ اور باقی ساری دنیا کو تصوراتی نرک میں دیکھ دیکھ ترس کھاتے رہتے ہیں __ 'سمے کا ساحل' میں دراصل روایتی 'سمے' ہے نہ متداول 'ساحل' __ بس زندگی ہے __ البتہ قاری کو خواندگی پہ مدعو کرنے کے لیے اس عنوان کو عبارت کیا گیا ہے، شاید بادہ و ساغر کو مستعار لینا مجبوری رہی کہ 'مشاہدہ حق' کی گفتگو کے ازلی عجز اس سے جدا ہونے کو آمادہ ہی نہیں ہو پاتے۔

البتہ اتنا تو ہو سکتا ہے کہ کہنہ علائم و رموز کو دہرانے کے بجائے نشانوں/ اشاروں کا نیا منظرنامہ سامنے لے آیا جائے! فوری ترسیل میں وہ مزاحم ضرور ہوگا لیکن معانی کا ایک اور جہان رو برو آ سکے گا۔ اس ناول میں ممکنہ 'عدم ابلاغ' کو اسی لیے وصف قرار دینے کا جواز دکھائی دے رہا ہے کہ مصنفہ نے آزمودہ و قدیم روش سے مستفید ہونے کی سہولت کو قبول نہیں کیا۔ باقی یہ تصریح بھی غالباً غیر اہم نہ ہوگی کہ ناول نگار کے لیے واقعہ نویسی میں کوئی مشکل موجود نہیں۔ وہ کڑی سے کڑی ملا کر مربوط ماجرا رقم کرنے پر قادر ہیں __ مثال کے طور پر 'نجو گائیکہ' اور سمی کے باپ والا وقوعہ __ اور بھی متعدد واقعات __ لیکن انھیں ایک ہی سرگزشت کو لے کر چلنے کی آسانی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ وہ واقعے کی بنت کو حتمی ہنر نہیں گردانتیں۔ اسی لیے وہ متنوع اطراف کو وہیں حاضر کر کے بیانیے کی شکل بالکل مختلف کر دیتی ہیں۔ جس میں ہر جملہ اپنی اکائی پر مصر ملے گا۔ اس طرح مفیض ارتباط کے تفریق ہو جانے سے خواندہ کچھ ہراساں ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں مصابرت درکار ہوگی۔ ان اکائیوں کے انجذاب کی خاطر اپنی استعداد کو فعال کرنا ہوگا۔ جس قاری کو ماتن ہونے کا تجربہ حاصل نہیں رہا، اُس کے لیے اس نوع کا متن اجنبی ہوگا۔ فی الوقت یہی عرض کرنا ہے کہ اصولی سطح پر انسانی ذہن سیدھی لکیر میں متواتر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسے طے ہی سمجھیے کہ وہ بیک وقت متخالف اکناف میں جمپ کرے گا اور زماں کی بھی نفی کرے گا۔ ایک ہی سمے

میں ماضی، حال اور مستقبل سے معاملہ کرے گا۔ 'شعور کی رو' یہ کہنا سننا جتنا آسان ہے، اتنا ہی پیچیدہ تفاعل ہے۔ اپنے اندر جھانک لینے سے البتہ اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ درحقیقت فرد کے سامنے جو بھی مرتب صورت میں ہے اسے شعوری کوشش کے ساتھ مرتب بنایا گیا ہے۔

یہ جو 'معانی' ہیں، ترتیب ہی کی کوکھ سے تو نکلے ہیں۔[۲] سماج بھی صدیوں سے چلی آ رہی ترتیب کا حساس نگہدار ٹھہرا۔ اجتماعی یادداشت کو عصمت کا درجہ اسی لیے دیا گیا تاکہ سب کچھ مرتب رہے ___ یوں ہر 'اکائی' کو دبانا ایک وتیرا بنا ___ شاید اس طرف سے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ جب تک اکائی پر مرکوز نہیں ہوا جائے گا، غلطی کی درستی ممکن نہیں۔ سپورٹ سسٹم میں خامیوں کا چھپ جانا قدیمی آزمودہ حربہ ہے۔ سو، مانوس بہاؤ میں تو 'معانی' اپنے آپ پیدا ہو جایا کرتے ہیں ___ ممکن ہے یہ مثال قدرے دلچسپ لگے کہ پروفیشنل پروف ریڈر اردو عبارت کو دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں پڑھتے ہیں۔ اس طرح لفظ نگارشی تسلسل سے الگ ہو کر اپنے انفراد کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ یوں اس کا املا صحیح کر لیا جاتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ آسودگی چاہے ترتیب میں مضمر ہوا کرے پر فکشن انہونی/حادثے کی تعذیب سے ملے گا۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ کبھی اس زاویے سے بھی سوچنا چاہیے کہ تاش کے پتے 'غیر مجلد' ہوتے ہیں ___ ہر کارڈ الگ ___ لیکن اس سے سو کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔ شیرازہ بندی کی کتنی انواع موثر ہیں، یہ اپنی جگہ ایک موضوع ہے۔[۳]

حواشی:

۱۔ تیسرے ناول 'غیر مطبوعہ جیون' میں بھی کم و بیش یہی تکنیک موثر ملے گی۔ اس عاجز کی رائے میں مصنفہ یوں جملہ امکانات بروئے کار لے آئی ہیں۔ سو، توقع ہے اب ان کا خلاق ذہن نئی سمت کی دریافت کو اپنی جستجو کا محور بنائے گا۔

۲۔ سچ کہا گیا ہے: ''ایک مرتب اور بامعنی تحریر کی شناخت اور اس کا یاد رکھنا اس تحریر کے یاد رکھنے سے زیادہ آسان ہے جو بظاہر بے ہنگم اور بے معنی ہو!''

۳۔ 'سے کا ساحل' کے تعلق میں بالارادہ ایک ہی جہت پر بات کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک روشن فکری و روحانی سفر کا اجمالی جائزہ

ادب کی تاریخ میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جو محض اشاعتِ کتاب کا نہیں بل کہ ایک نئی فکری، جمالیاتی اور روحانی جہت کے آغاز کا اعلان ہوتے ہیں۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز، سنجیدہ اور معتبر شاعر کامران ناشط کا پہلا شعری مجموعہ ''درویش لمحے'' بھی ایسا ہی ایک بارکت لمحہ ہے۔

ایک ایسی تخلیقی پیشکش جو روایت، تجدید اور روحانیت کے حسین امتزاج کے ساتھ اردو غزل کو نئی معنویت عطا کرتی ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ شاعری محض فنی مہارت کا نام نہیں بل کہ باطن کی سچائی، احساس کی پاکیزگی اور روح کی درویشی سے جنم لینے والا وہ نور ہے جو لفظوں میں ڈھل کر دلوں کو منور کرتا ہے۔ شاعری کی دیوی ایک نازک مزاج، خوددار اور انا پرست دیوی ہے۔ وہ وہاں قیام نہیں کرتی جہاں طمع، لالچ اور دنیاداری کی گرد بسی ہو۔ جیسے ہی مفاد کی ہوا چلتی ہے، وہ خاموشی سے اپنا دامن سمیٹ لیتی ہے۔ اس لیے درویش شاعر کی آواز الگ ہوتی ہے اور دنیادار شاعر کی الگ۔ بظاہر فنی تقاضے پورے ہونے کے باوجود وہ کلام جس میں خلوص، عجز اور بے نیازی نہ ہو، اکثر تاثیر، روشنی اور برکت سے محروم رہتا ہے: وہ صفحہ تو بن جاتا ہے مگر روشن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس درویشی، عاجزی اور بے نیازی وہ اوصاف ہیں جو شاعر کے باطن کو منور کرتے ہیں۔ یہی وہ باطنی چراغ ہیں جن سے لفظوں میں حرارت، معنی میں گہرائی اور فکر میں رہنمائی پیدا ہوتی ہے۔ یوں سچا شاعر وہی بنتا ہے جو دنیاوی خواہشات سے اوپر اٹھ کر دل کی سادگی اور روح کی سچائی کے ساتھ کلام تخلیق کرے۔

منظر حسین اختر

کامران ناشط کی شاعری اسی درویشانہ صداقت کی آئینہ دار ہے۔ اردو غزل کا سفر صدیوں پر محیط ہے یہ عظیم شعری روایت ایک وسیع اور زرخیز میدان بن چکی ہے۔ اس روایت میں ہر عہد میں کچھ ایسے شاعر ابھرتے ہیں جو نہ صرف اس سے فیض یاب ہوتے ہیں بل کہ اس میں اپنا منفرد رنگ بھی شامل کرتے ہیں۔ کامران ناشط انہی اہم آوازوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اپنے پہلے ہی مجموعے میں اپنی انفرادیت، فکری گہرائی اور تخلیقی توانائی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

کامران ناشط کے ہاں محبت بھی یکطرفہ حسرت، داخلی تقسیم اور خواب و تعبیر کے فاصلے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

''خواب میری آنکھ میں، تعبیر اُس کی آنکھ میں''

یہ وہ کرب ہے جو جدید انسان کے جذباتی انتشار کی نمائندگی کرتا ہے۔

ان کے اشعار میں ایک طرف رومانوی تخیل کی لطافت ہے تو دوسری طرف حقیقت کی سخت زمین بھی۔ یہی کشمکش ان کی شاعری کو جمالیاتی گہرائی عطا کرتی ہے۔ وہ احساس کی راکھ سے معنویت کے ستارے چنتے ہیں اور زندگی کی بے معنویت کے خلاف جذبے کی روشنی کو زندہ رکھتے ہیں:

زندگی جب بے ارادہ رقص کرنا چھوڑ دے
بھیج دیتے ہیں نیا پیغام جذبے آپ کے

.....

یہ شعر محض ایک احساس نہیں بل کہ ایک روحانی بغاوت ہے زندگی کو دوبارہ معنی دینے کی ایک تخلیقی کوشش۔

کامران ناشط کی شاعری کا ایک اہم پہلو اس کی روحانیت بھی ہے، جو رثائی اور نعتیہ کلام میں اپنی بلند ترین صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ کربلا کے جذب وفا کو وہ جس عجز اور تاثیر کے ساتھ بیان کرتے ہیں، چشم و دل کو اشک بار کر دیتا ہے۔ اسی طرح نعتیہ اشعار میں نسبتِ رسولؐ کو وہ اپنی مکمل شناخت بنا دیتے ہیں:

نعت ہی مسلک مراد، میرا قبیلہ نعت ہے''

.....

یہاں عقیدت شعور میں ڈھل کر ایک زندہ تجربہ بن جاتی ہے۔

درویش لمحے ''محض ایک شعری مجموعہ نہیں بل کہ ایک فکری اور روحانی تجربہ ہے۔ یہ وہ کلام ہے جو قاری کو اس کے'' باطن، اس کے عہد اور اس کے رب سے ایک نئے مکالمے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس میں

روایت بھی ہے، جدت بھی:
زمین بھی ہے اور آسمانی بھی۔ یہ وہ شاعری ہے جو صرف پڑھی نہیں جاتی بل کہ محسوس کی جاتی ہے۔

کامران ناشط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ درویشی کو محض موضوع نہیں بل کہ اسلوب بنا دیتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ شور ہے، نہ دعویٰ نہ نمائشی چمک

ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی ان کا منفرد لہجہ اور اسلوب ہے۔ ان کے ہاں روایت سے وابستگی محض عقیدت نہیں بل کہ شعور اور فنی بصیرت کا اظہار ہے۔ وہ کلاسیکی سانچوں کو برقرار رکھتے ہوئے جدید استعاروں، تشبیہوں اور داخلی کیفیات کو اس مہارت سے شامل کرتے ہیں کہ ان کا ہر شعر ان کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جسے میں شاعری کی اصل انفرادیت قرار دیا۔ روایت میں رہ کر اس کا چہرہ بدل دینا۔

کامران ناشط روایت سے ٹکراتے نہیں بل کہ اس سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں یاد، تعلق، محبت اور انسانی رشتوں کی معنویت ایک زندہ تجربے کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اشعار میں یاد کو ایک جسمانی موجودگی میں ڈھال کر ایسے معنوی امکانات پیدا کرتے ہیں جو قاری کو براہِ راست اپنے اندر کھینچ لیتے ہیں۔ ان کا کلام ایک ایسا متنی مکالمہ ہے جو ہر قاری کے لیے نئے معنی اور نئے زاویے پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ Roland Barthes نے بیان کیا ہے۔

ان کے اشعار میں جدید شہری زندگی کی تنہائی، اجنبیت اور وجودی کرب نہایت مؤثر انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔

اپنے اپنے راستے تھے، اپنی اپنی منزلیں
ہم اکیلے رہ گئے، احباب ہجرت کر گئے

.....

یہ محض ایک فرد کا دکھ نہیں بل کہ عہدِ حاضر کی اجتماعی تنہائی کی تصویر ہے وہ Metropolitan Alienation جو جدید انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ اسی طرح

''ہر شخص غم کی گٹھڑی اٹھائے پہنچ گیا''

.....

اس میں انسانی وجود کا اجتماعی بوجھ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اُردو غزل کے عصری رویے

ڈاکٹر نثار ترابی ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں، انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید میں بھی اپنا ایک مقام بنایا ہے اور اس حوالے سے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ انھیں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے یہ عنوان ملا تھا ''اُردو غزل کے عصری رویے'' یہ کتاب قریباً 600 صفحات پر مشتمل ہے۔

جدید غزل کے ایک نمائندہ اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک الگ اور منفرد تخلیقی شناخت ہے۔ غزل سے اپنی اسی طبعی اور فکری مناسبت کی بنا پر انھوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کی سطح و معیار کے تحقیقی مقالے کے انتخاب کے مرحلے پر بھی تحقیق کے لیے ''اُردو غزل کے عصری رویے'' کے عنوان سے اپنے موضوع کو چُنا۔ انھیں مذکورہ تحقیقی و تنقیدی کام کی بے مثال تکمیل پر کراچی یونی ورسٹی سے 2006 میں پی ایچ ڈی کی سند فضیلت سے نوازا گیا۔

اردو غزل کے عہد میں عہد ارتائی ایک بھرپور اور مکمل دستاویز ہے۔ اس کتاب میں غزل کے فکری، موضوعاتی، فنی اور اسلوبی

بیاجی

ارتقا کو تاریخی، دیانت داری اور محققانہ باریک بینی اور اسلوب کی دل نشینی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی جی نے قدیم و جدید عہد کے درمیان تخلیقی ربط کو نئے تناظر میں واضح کیا ہے۔

اس کتاب میں روایتی غزل سے لے کر جدید رجحانات کی حامل نئی غزل کا فکری و فنی احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ صرف تحقیقی مطالعہ نہیں بل کہ ادبی شعور کی تازہ تشریح ڈاکٹر صاحب نے تمام عہد کی غزل کے بدلتے ہوئے لہجے، علامتوں اور استعاروں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے غزل کے فکری بحران، جمالیاتی امکانات اور نئے سوالات کو یکجا کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ طالب علموں، محققین اور قارئین کے لیے ایک قیمتی علمی و ادبی متاع ہے۔ یہ غزل کے کلاسیکی عہد سے معاصر عہد تک کے احساسات، ورد اور تجربات کی نئی تعمیر ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے روایت اور جدت کے درمیان ایک فکری پل قائم کیا ہے۔

ایک طویل دورانیے پر پھیلے ہوئے ان کے اس ریاضت طلب علمی کام کو معتبر ناقدین ادب نے بجا طور پر سراہا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سعادت سعید، غلام حسین ساجد، حسین مجروح، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر بشیر احمد قادری سمیت کئی بڑوں نے اسے اُردو غزل کے فنی معیار اور فکری تناظر پر ایک گراں مایہ تحقیق قرار دیا ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے یہ کتاب اُردو غزل کے شعری شعور کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کی فکری تاریخ میں ایک نئے اور اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آئینے میں ماضی اور حال دونوں کی صورتیں عکاس ریز ہیں۔

ڈاکٹر نثار ترابی کو اس گراں قدر علمی و ادبی کاوش پر دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ان کی یہ محنت اردو ادب کی فکری و تخلیقی روایت میں ایک روشن باب ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

آفتاب اقبال بانو سفرنامہ نگار

دردانہ نوشین خان

آفتاب اقبال بانو سے میرا تعارف ماہنامہ ادب معلیٰ کی معرفت ہوا اللہ تعالیٰ رانا ناصر صاحب کی مغفرت فرمائے وہ ہماری باہم جان پہچان کا وسیلہ بنے۔

آفتاب اقبال بانو نے پشاور یونیورسٹی سے اُردو ادب میں ماسٹرز کیا۔ اُن کا تعلق کے پی کے سے ہے ریڈیو پاکستان سے بحیثیت پروڈیوسر ملازمت کا آغاز کیا۔ بعد ازاں کینیڈا تشریف لے گئیں اور وہاں جرنلزم میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مجھے اپنے چار عدد سفرنامے ارسال کیے۔

1- ملائیشیا کتنا حسین

2- استنبول سے گیلی پونی تک

3- احوال جمال روس

34- سرزمین چین

یہ کُتب نہ صرف احوال سفر، تفاصیل سیاحت، آمدورفت کی دلچسپ معلومات اور تصاویر سے مزین ہیں بل کہ ہر ملک کی تاریخ اور سیاحی مقامات کی تاریخی اہمیت پر تحقیقاتی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں ''ملائیشیا_ کتنا حسین..... بانو صاحبہ 2017 میں ملائشیا گئیں۔ 2020 کے اوائل میں ملائیشیا پر سفرنامہ مکمل کیا۔ کرونا

وائرس کی وجہ سے یہ کتاب اُس سال نہ چھپ سکی-2023 میں یہ کتاب چھپی-

''ملائیشیا ___ کتنا حسین'' کے آغاز میں حفیظ الرحمٰن خان، ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی اور ناصر علی سیّد کے اظہارات خیال ہیں- یہ سفرنامہ کے مطالعہ کا شوق مہمیز کرتے ہیں-

آفتاب اقبال بانو کا انداز تحریر سادہ اور دلکش ہے- اس سفرنامے کے پارہ (12) ابواب ہیں، ہر سفرنامے میں کچھ باتیں اور یادیں سفرنامہ نگار کی ذاتی ہوتی ہیں اور کچھ عمومی- قاری کو دلچسپی مجموعی منظرنگاری، علاقائی تاریخ، مواقع کے مطابق باہمی مکالمہ جات اور حالات حاضرہ سے متعلق معلومات سے زیادہ ہوتی ہے-

لکھا گیا ہے-

''سیاحت ایک مہنگا شوق ہے نہ صرف ڈالرز میں ادائیگیاں ہوتی ہیں بل کہ آپ کو ایک بھرپور وقت، اچھی صحت اور برداشت کی بھی ضرورت ہے- اور یہ بالکل درست لکھا ہے ملائیشیا کے سفر کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ ملنڈو ایئر لائن کے جہاز میں ملنے والا ڈنر گھیا توری اُبلے ہوئے آلو اور اُبلے ہوئے موٹے چاول پر مختصر ہے اور اتنا کم ہے کہ ''شاید کوئے'' کا کھانا ہے''

پاکستان اور ملائیشیا کے وقت میں 3 گھنٹے کا فرق ہے کتاب کے آخر میں دی گئی سیاحتی تصاویر سے مقامات اور سیاحتی گروپ کا تعارف ہونے میں مدد ملی- سکائی کیب کے مناظر horrible ہیں- سکائی کیب کی زمین (فرش) شیشے کا ہونے سے بُلندی کی دہشت میں اضافہ ہوتا ہے-

ملائیشیا کی ترقی دیکھ کر سفرنامہ نگار لکھتی ہیں-

''مجھے دُنیا بھر کے اُن قائدین کے خوابوں پر رشک آ رہا ہے اور ملائیشین قوم پر بھی رشک آ رہا ہے جن کے شاید نیک اعمال اُن کو ایماندار اور محبّ الوطن قائدین سے نوازتے ہیں قوموں کو مال و دولت اور ٹیکنالوجی امیر نہیں بناتی- ترقی یافتہ بننے کے لیے عوام اور رہنماؤں کا محبّ الوطن اور ایمان دار ہونا بڑا ضروری ہے- صفحہ نمبر 52

ٹوئن ٹاور میں جب 36ویں منزل کے بعد 86ویں منزل کا پڑھا تو میرا بھی دماغ چکرا گیا- کیا واقعی؟

86ویں منزل پر بنے ہوئے خوبصورت ترین واش رومز اور واش رومز کے باہر انتظار گاہ کی چھت ستاروں بھرے آسمان سے سجائی گئی جسے دیکھ کر آفتاب اقبال بانو کے دل سے دعا نکلی کہ کاش پاکستان بھی اتنی ترقی کرلے-

یہ کتاب ملائیشیا کی خوب صورت تصاویر،

لوگوں کے روّیے، ملائیشیا کی ترقی کے تقابل کے فکری تاثرات اور فقرات کے ساتھ اختتام پزیر ہوتی ہے اور قاری پر بانو صاحبہ کے سفرنامہ لکھنے کی صلاحیت کا عمدہ تاثر چھوڑتی ہے۔

(کتاب) احوال جمال روس:

یہ کتاب روس کی تاریخ کے بارے میں مسلسل اور اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ تاریخ اقوام سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

مصنفہ کہیں کہیں روس کے عام لوگوں کے اخلاقی روّیے کا ایشیائی اور یورپین ممالک کے عوام سے کرنے لگتی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

"کسی بھی عورت، مرد کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ یا اپنا پن یا مہمان نوازی کی سی بات نہیں ہے۔ اس معاملے میں ایشائیوں کی طرح مغربی ممالک کے لوگ بھی بڑی اپنائیت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ہیلو، گڈ مارننگ یا حال پوچھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شکریہ کہنا کبھی نہیں بُھولتے Sorry کہنا بھی مغرب والوں کا شعار ہے" صفحہ نمبر 67

گم اسٹور بہت دلچسپ لگا (صفحہ نمبر 50) جہاں دُنیا کی ہر چیز موجود ہے۔

مصنفہ لکھتی ہیں۔

ماسکو گزشتہ کئی دہائیوں سے آرٹ اور کلچر کی دُنیا میں بہت آگے جا چکا ہے۔ ماسکو کے وہ صنعتی علاقے جو مزدوروں سے بھرے رہتے ہیں۔ اب تخلیق کاروں کے گھر بن گئے ہیں، جہاں کارخانے اور ورکشاپوں سے دُھواں اُٹھا کرتا تھا اب وہاں آرٹ کی نمائشیں لگی ہوئی ہیں۔

ماسکو میں سفید راتیں ہوتی ہیں رات کے ساڑھے دس بجے ہیں لیکن آسمان روشن ہے۔ سفید شام اور سفید رات، رات کے 11 بجے تک کسی عمارت میں اندر یا باہر بلب جلا ہوا نظر آتا ہے۔ 21 اپریل سے 21 اگست تک سفید راتوں کا وقت ہے رات تاریکی میں تبدیل نہیں ہوتی جھٹپٹا سا رات بھر چھایا رہتا ہے۔ روس کی حکومت سفید راتوں میں ثقافتی تقریبات کا اہتمام کرتی ہے۔ 12 جون کو سفید رات منانے کی چھٹی ہوتی ہے۔ سفید راتیں شروع ہوتے ہی لوگ سارا دن کام کرتے ہیں دن 21 گھنٹے کا ہوتا ہے۔

آفتاب اقبال بانو لکھتی ہیں۔ "یہ اللہ کی قدرت کا حسین اور حیرت انگیز نظارہ ہے کہ اماوس کی کالی رات کے مصنفین ایسی سفید رات کو کالی سیاہ رات کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے"

سینیٹ پیٹرز برگ (باب نمبر 17) کی سیر سے قبل اس کی تفصیلی ہسٹری معلومات میں قیمتی اضافہ کرتی ہے۔ جہاں تاریخ سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ اثاثہ ہے وہاں عام قارئین کے لیے مقامات کی لفظی تصویر کشی، سہولیات سفر، صفائی، طرز تعمیر مکانات، سڑکیں، ہوٹل، ریستوران، لفٹر کی حالت (کمرہ نمبر 11008 پڑھ کر اندازہ کیجیے ایک فلور پر ہزاروں کمرے) مرید برآں بانو صاحبہ نے ساتھی کولیگز اور گائیڈ ہیڈ طارق حیات کی مستعدی اور محنت کی تحسین کی ایک بھرپور دن کے بعد بھرپور کھانا، چائے، کافی اور قضا نمازیں ادا کر کے گھوڑے بیچ کر سونا۔

سینٹ باسل آئی لینڈ جہاں جولائی کے مہینے میں بھی سخت سردی ہے۔ سائبریا کے میدان یہاں سے کچھ فاصلوں پر ہیں۔ ریائے نیوا یورپ بھر میں چوتھا بڑا دریا ہے۔ دوستوئیفسکی کا گھر دیکھنا جو نکولس اوّل ظالم زار بادشاہ کے دور میں رہا۔ زار بادشاہ ادیبوں شاعروں کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ دوستوئیفسکی کو آٹھ مہینے بغیر کسی جرم کے سخت ترین قید میں رکھا اُسے موت کی سزا سنائی گئی عین وقت پر بچا کر چار سال قید با مشقت سنا دی گئی۔

ٹالسٹائی بھی روس کے ناول نگار تھے۔ یہ زار روس کے زمانے کے بعد میں آئے۔ نکولائی گوگول روس کا انتہائی ذہین لکھاری Overcoat ان کی کہانی تھی۔ اس کا ناول Dead Soul دُنیا بھر میں مشہور ہوا۔ پھر وہ دماغی بیمار ہو گیا۔ اپنی بے شمار تحریریں آگ میں پھینک دی۔

مصنفہ نے ایک مکمل باب ''روس، لٹریچر، آرٹ اور سینما، پر لکھا ہے۔''

کیتھرین پیلس (محل) کی منظر نگاری اس کے حقیقی حُسن کی تصویری جھلک دکھاتی ہے۔ بادشاہوں نے بھی جب تک زندہ ہے اپنی زندگی کو جنت بنائے رکھا۔ یہ باتیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس محل میں 696 لیمپ روشن کیے جاتے تھے جنگ عظیم دوم میں ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تھا اور کیتھرین پیلس کو جلا کر راکھ کر دیا۔

باب نمبر 18 میں سیر سے پہلے آخری خریداری کا مذکور ہے یقیناً یہ سفرنامے آفتاب اقبال بانو کے سیاحتی کولیگز کے لیے قیمتی اور یادگار مطالعہ ہوں گے۔

سفرنامہ سرزمین سپین:

اس کتاب کا سن اشاعت 2014 ہے۔ دراصل یہ آفتاب اقبال بانو کا دوسرا سفرنامہ

ہے دیگر سفرنامے اس کے بعد لکھے گئے بانو صاحبہ نے یہ سیاحتی سفر SAC کی معرفت کیے سوسائٹی آف ایشین سولائزیشن کی بنیاد 23 مارچ 2000 میں آرکیالوجسٹ ڈاکٹر احمد حسن ہمدانی (ستارۂ امتیاز) نے رکھی۔

جیسا کہ ہر حساس دل مسلمان سپین میں مسلمانوں کے 800 سالہ دور حکومت کے عروج کو سوچتا اور زوال کو کھوجتا ہے مصنفہ پر بھی مسلسل یہی کیفیت طاری رہی۔

میڈرڈ میں کھانے میں حرام کے امکانات زیادہ تھے۔ یہاں زیادہ تر اُبلے ہوئے کھانے سبزیاں نوڈلز کھائی گئی۔ میڈرڈ اور بارسلونا کے عجائب گھر میں دُنیا کے عظیم مصوروں کی مشہور ترین پینٹنگز ہیں مگر اُن کی تصویر بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

سپین کی پہچان ''بل فائٹنگ'' ہے جو ایک وحشیانہ کھیل ہے اس کے بارے میں تفصیلی لکھا گیا ہے۔

اندلس_ جہاں 712 میں موسیٰ بن نصیر نے فتوحات کا آغاز کیا۔ جہاں اوس اور خزرج قبائل مدینہ سے آکر بس گئے جہاں کئی تابعین کے مزار ہیں۔

قرطبہ، مدینہ الزہرہ، مسجد قرطبہ، سویا کے بعد غرناطہ ان کی تاریخ کھنگالتے ہوئے مصنفہ نے دلی کرب محسوس کیا ہے اور کرایا ہے۔

غرناطہ جسے اندلس کا دمشق کہتے ہیں۔ مسلم تہذیب و تمدن کے حوالے سے بے حد اہمیت کا حامل شہر ہے۔ اس باب میں الحمرا محل کی شان و شوکت۔ مسلمان حکومت کا زوال اور یہیں پر آخری مسلمان تاجدار کا عیسائی حکمرانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا۔ عیسائی حکمرانوں کا معاہدہ کی شرائط سے مکمل طور پر بدل جانا مسلمانوں کا بدترین قتل عام اور مسلمانوں کو عیسائی بننے پر مجبور کر دینا تاریخ کے یہ خون آلود ابواب آفتاب اقبال بانو کو مغموم اور اُن کے قلم کو اشکبار کر دیتے ہیں۔

لکھتی ہیں:

''میں بہت دل گرفتہ ہوں۔ اسپین کی سیر کا چارم میرے لیے ختم ہو چکا ہے۔ بے شعوری اور کم علمی شاید دُنیا کی نعمتوں میں سے ہی ہے کیونکہ یہ انسان کو فکرات سے بُدا رکھتی ہے۔

یوں دل گرفتگی پر اس کتاب کے اختتام ہو جاتا اور اسلام آباد کا ایئرپورٹ اپنے ہم وطنوں کا استقبال کرتا ہے۔

میں مصنفہ کی یادداشت، سادہ اسلوب، مزین نقطوں کے مناظر، مکالمے، مسائل و ضروریات سفر کی طرف متوجہ کرنا ان تمام اوصاف کی داد دیتی ہوں۔

☆☆☆☆☆

''دسمن زارِ نعت ایک کہنہ مشق شاعر کا صحیفہء نعت''

تصور اقبال

عہدِ موجود میں نعت نگاری کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ چکے ہیں شاید اسی لیے موجودہ صدی کو نعت کی صدی کہا جا رہا ہے۔ بلاشبہ نعت عطائے رب ذو الجلال اور رحمت حبیب خدا ہے۔ عطا اور لطف وکرم کے بغیر نعت کی تخلیق اور تکمیل ممکن نہیں۔ نعت کی روایت اگرچہ بہت پرانی ہے اور سابقہ ادوار میں نہ صرف نعت کہی گئی بل کہ اس کی ترویج واشاعت اور فروغ کا اہتمام بھی بطور خاص ہوتا رہا لیکن جس طرح سے نعت آج لکھی، پڑھی، جانچی اور پرکھی جا رہی ہے یہ اس بات کی واضح اور قوی دلیل ہے کہ نعت اب صحیح معنوں میں رفعت بلندی اور ترقی کی تمام منازل طے کر چکی ہے اور نعت کا مستقبل اس سے بھی کہیں زیادہ روشن اور تابناک دکھائی دے رہا ہے۔

آج ہر شاعر کی کوشش اور خواہش ہے کہ وہ کم از کم ایک نعت لکھ کر نبیِ آخر الزماں سرورِ دو جہاں سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرے اور اپنے حصے کا چراغ جلائے، لیکن اس سب کے باوجود یہ بات ذہن نشین رہے کہ نعت کہی نہیں جاتی بل کہ نعت ہو جاتی ہے۔

نعت کہنے میں اور نعت ہونے میں جو واضح

فرق ہے اس کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ایک حقیقی نعت گو شاعر جس کو نعت کہنے کی سعادت اور سند ملی ہوتی ہے وہ یقیناً یہ کام بآسانی بہ حسن و خوبی کرے گا جبکہ دوسری طرف نعت زبردستی یعنی خود پر جبر کر کے کہنے والا سارے فنی کمالات رکھتے ہوئے بھی ناکام اور نامراد رہے گا، گویا دل اور دماغ کا حاضر اور بیدار ہونا ہی بیدار بختی کی ایک کڑی ہے جس پر ''سمن زار نعت'' ہر لحاظ سے۔ پوری اترتی ہے۔ یہ ایک ایسے کہنہ مشق، سکہ بند اور سلیقہ مند شاعر کی تقدیسی کتاب ہے جسے یہ حمد و نعت کہنے کی سعادت رب ارض وسما، خالق دو جہاں نے عطا کی ہے۔

نسیم سحر صاحب وہ خوش نصیب اور بیدار بخت انسان ہیں جن پر آقائے دو جہاں رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰؐ کا خصوصی فضل و کرم ہے۔ آپ کو نعت کہنے کا سلیقہ اور قرینہ بھی آتا ہے اور آپ اس کا اظہار اپنے الفاظ میں کرنا بھی جانتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ آپ ایک ناقد اور محقق بھی ہیں۔ حمد و نعت پر تحقیق اور تنقید و تبصرہ نگاری گویا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ قبل ازیں نسیم سحر صاحب کے تین نعتیہ مجموعہ ہائے کلام بہ عنوان ''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' ''نعت نگینے'' ''اور محور دو جہاں'' منظر عام پر آ کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اور اہل نقد و نظر سے داد و تحسین سمیٹ چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کلام ''سمن زار نعت'' اپنے جملہ فکری اور فنی محاسن کے ہوتے ہوئے یقیناً سند اعزاز و اعتراف کا مستحق قرار پائے گا۔ اگرچہ سب سے بڑا اعزاز اور انعام تو بجائے خود نعت کی سعادت ہے جو ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی۔ عقیدت و محبت اور عشق و شیفتگی کے تمام ممکنہ رنگ ایک قاری کو اس کتاب میں خاص طور پر نظر آئیں گے۔ زبان و بیان پر قدرت، فکر و فن میں پختگی اور وارفتگی، الفاظ و تراکیب اور ردیف و قوافی کے استعمال میں مہارت اور ہنر مندی نسیم سحر صاحب کا خاصہ اور حصہ ہے، ہر کسی کو یہ ملکہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ان عوامل کے باوصف نعت کا حسن درحقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آتا ہے اور اپنا لوہا منواتا ہے۔ نسیم سحر صاحب کا کلام بنظر عمیق پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہایت آسان، سادہ، عام فہم، سلیس اور بے حد رواں ہے کسی قسم کی پیچیدگی کا احساس یا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

مصنف کا پرخلوص اور پرتاثیر لہجہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور منفرد بنا رہا ہے۔ ایسی شاعری جس میں ایک خاص قسم کی تڑپ اور سچا جذبہ کارفرما نظر آئے، وہ حاضری اور حضوری کے مراحل بآسانی طے کر لیتی ہے۔ نعت کا عنوان تو ایک ہی ہے لیکن اس میں متنوع اسالیب کی فراوانی اور روانی ایک نعت نگار کی مشاقی اور فکری بصیرت کی غماز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان کا لب ولہجہ اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی ذرا آگے ایک شاعر جب اپنے احساسات وجذبات اور خیالات وتصورات کا اظہار اور اقرار کرتا ہے تو اس کی خواہش اور کوشش حتی الوسع یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے تخلیقی وجدان اور علمی وادبی شعور کی دلالت اور وکالت کرے۔ پھر نعت تو موضوع ہی ایسا ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں۔
نسیم سحر صاحب نے اپنے سابقہ نعتیہ مجموعوں کے مقابلے میں اس کتاب میں مزید نئے اور کامیاب تجربات کیے ہیں۔ میری مراد ردائف وقوافی اور تراکیب لفظی میں جہانِ معنی پیدا کرنا ہے جن کی مثالیں ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے اپنے پیش لفظ میں دی ہیں۔ میں یہاں ان کو دہرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف سمجھتا ہوں، اس لیے قارئین کو "ثمن زارِ نعت" کی کم از کم ایک بار قرأت کی دعوت دیتا ہوں جو یقیناً ان کے ایمان کو تازگی اور روح ودل کو روشنی اور شادابی عطا کرے گی۔
عنوان کے اعتبار سے میں نے اس کتاب میں شامل نعتیہ کلام کو اپنی اس مختصر تحریر کا حصہ بنایا ہے اگرچہ حمد سلام اور مناقب اس کتاب کی انفرادیت اور جاذبیت میں اضافے کا باعث ہیں۔ القصہ "ثمن زارِ نعت" نعتیہ شاعری اور آج کے نعتیہ منظر نامے میں ایک قابلِ قدر یادگار، خوشگوار اور باوقار اضافہ ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ منتخب اشعار بطور حوالہ اور تبرکاً پیش کروں اور شاعر کی قادرالکلامی، ہنرمندی، مشاقی اور فنی وفکری دسترس کی داد دوں، لیکن یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ مجھے آدھی کتاب درج کرنا پڑے گی جس کی میرے خیال میں ضرورت نہیں۔ قارئین اس کتاب کا مطالعہ کریں اور میری بات کی تصدیق کریں۔
نسیم سحر صاحب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد اور بے حد و بے حساب داد۔

☆☆☆☆☆

،،صدائے کُن،، اور محسوسات

ظفر حیات ظفر کا تعلق رحیم یار خان کے مضافاتی علاقے لیاقت پور سے ہے، اور یہی مضافاتی پس منظر ان کی شاعری کی فکری فضا اور احساساتی لہجے میں پوری شدت کے ساتھ جھلکتا ہے۔ مضافات کی زندگی محض جغرافیہ نہیں ہوتی بل کہ ایک مکمل تجربہ ہوتی ہے جہاں زمین کی دھول، کچے آنگن، محدود وسائل اور مسلسل جدو جہد انسان کے احساس کو ایک خاص طرح کی سچائی عطا کرتے ہیں۔ یہاں زندگی کو برقرار رکھنا، سانس کے ربط کو قائم رکھنا، اور اندرونی انتشار کے باوجود خود کو سنبھالنا ایک مسلسل امتحان ہے۔ یہی تجربہ ظفر حیات ظفر کی شاعری میں لفظ بن کر ابھرتا ہے۔

ان کا شعری مجموعہ ''صدائے کُن'' اس مضافاتی تجربے، داخلی کشمکش، روحانی سوالات اور سماجی حقیقتوں کا ایک خوب صورت امتزاج ہے۔ یہ صرف غزلوں کا مجموعہ نہیں بل کہ ایک ایسا شعری بیانیہ ہے جس میں انسان اپنے وجود، اپنی محبت، اپنی محرومی اور اپنے خوابوں کے ساتھ مکالمہ کرتا نظر آتا ہے۔

ان کی شاعری میں ایک طرف کلاسیکی غزل کی خوشبو ہے تو دوسری طرف جدید انسان کا اضطراب۔ کہیں محبوب کائناتی حقیقت بن جاتا ہے تو کہیں زندگی ایک بے مقصد سفر محسوس ہوتی ہے۔ یہی دوہرا پن ان کے شعری مزاج کی بنیادی پہچان ہے۔

ان کے یہ اشعار ایک داخلی کشمکش اور فکری تہذیب کی خوبصورت مثال ہیں:

زبان پہ ذکر الٰہی کے سلسلے جاری
پہ دل میں شوق بتاں ہے، مگر یہ کس سے کہیں؟

میرا وجود سہولت پذیر ہے ، لیکن!
ہوائے نفس جواں ہے مگر یہ کس سے کہیں؟

.....

یہاں انسان اپنے اندر موجود دو متضاد کیفیات

ارشد محمود ارشد

کے درمیان پھنسا ہوا ہے - ایک طرف روحانیت اور اخلاقی شعور ہے اور دوسری طرف انسانی خواہشات اور نفس کی طاقت۔ شاعر اس تضاد کو حل نہیں کرتا بل کہ اسے محسوس کر کے قاری تک منتقل کر دیتا ہے۔

اسی طرح محبت کے کلاسیکی اور کائناتی تصور کو وہ نہایت خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں:

تُو ہے تو مری جان خزائیں بھی بہاریں
تو ہے تو یہ صَرصَر بھی صبا لگنے لگی ہے

.....

یہاں محبوب کی موجودگی پوری کائنات کے مزاج کو بدل دیتی ہے۔ موسم، ہوا اور فضا سب محبوب کے احساس سے معنی حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہی روایت ہے جس میں محبوب محض فرد نہیں رہتا بل کہ ایک کائناتی توانائی بن جاتا ہے۔

ان کی شاعری میں وجودی بے معنویت اور سماجی حقیقتوں کا بیان بھی واضح ہے

دن بتائیں کہ رات بے مقصد
کٹ رہی ہے حیات بے مقصد

ایسی آوارگی مُسلط ہے
گھوم لیں شش جہات بے مقصد

.....

یہ اشعار جدید انسان کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جہاں زندگی حرکت میں تو ہے مگر سمت اور مقصد سے محروم ہے وقت گزر رہا ہے مگر معنی تحلیل ہو رہے ہیں۔

اسی طرح مضافاتی زندگی کی تلخی اور غربت کا احساس ان کے ہاں ایک سچائی بن کر ابھرتا ہے

کچے آنگن میں دھول اڑتی ہے
مفلسی کا دھمال مت پوچھو

.....

یہاں ''کچا آنگن'' صرف ایک منظر نہیں بل کہ ایک پوری سماجی حقیقت ہے دھول اور مفلسی ایک دوسرے میں یوں مدغم ہیں کہ زندگی کا ہر گوشہ اس کی زد میں آ گیا ہے۔

ان کی شاعری میں محبت صرف جذبات نہیں بل کہ شناخت کا مسئلہ بھی ہے:

میری چاہت کا اعتراف کرے
میری ہستی کو دو جہاں سمجھے

مجھ سے تنہائیوں میں کھل جائے
اور مجھے اپنا رازداں سمجھے

.....

یہاں محبت ایک مکمل ادراک کی صورت اختیار کر لیتی ہے جہاں محبوب صرف شریکِ سفر نہیں بل کہ وجود کی مکمل توسیع بن جاتا ہے۔

ظفر حیات ظفر کے اشعار میں صوتی تکرار اور علامتی فضا ایک نئی جہت پیدا کرتی ہے۔

مرے کانوں کے پردے گونجتے ہیں
صداؤں سے صدائیں مل رہی ہیں

ترے گیسو ہوا کے دوش پر ہیں
گھٹاؤں سے گھٹائیں مل رہی ہیں

یہاں آواز اور فضا ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ ''صداؤں سے صدائیں'' اور ''گھٹاؤں سے گھٹائیں'' محض لفظی حُسن نہیں بل کہ ایک ایسی داخلی کیفیت ہے جہاں انسان اپنے ہی وجود کی بازگشت میں گم ہو جاتا ہے۔ محبوب فطرت کے ساتھ یوں جڑ جاتا ہے کہ اس کے وجود کی پہچان ہوا اور بادلوں میں ہونے لگتی ہے۔

ان کے ہاں ایک اور نمایاں رجحان غربت، مجبوری اور طبقاتی حقیقتوں کا بیان ہے

جی رہا ہوں ، یہی غنیمت ہے
اور زیادہ کمال ، مت پوچھو

کچے آنگن میں دھول اڑتی ہے
مفلسی کا دھمال مت پوچھو

.....

یہ اشعار صرف ذاتی احساس نہیں بل کہ ایک اجتماعی تجربہ ہیں۔ یہاں جینے کو بھی ایک احسان سمجھا گیا ہے، کیونکہ حالات کی سختی میں زندگی خود ایک بوجھ بن جاتی ہے۔

محبت اور تنہائی کے تعلق کو وہ اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ انسان کی پوری شناخت بدل جاتی ہے وجودی اضطراب اور وقت کے زوال کا احساس ان کے ہاں نہایت شدت سے موجود ہے۔

ہر سانس کہ آتی ہے رگ جاں سے اُلجھ کر
ہر لمحہ نیا ایک ستم ٹوٹ رہا ہے

آجا کہ ترے بعد پریشاں ہیں بہاریں
موسم کے تقاضوں کا بھرم ٹوٹ رہا ہے

.....

یہاں سانس بھی ایک اذیت بن جاتی ہے اور وقت بھی ایک زخم، محبوب کی غیر موجودگی صرف جذباتی خلا نہیں بل کہ کائناتی انتشار کی علامت بن جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ظفر حیات ظفر کی شاعری مضافاتی تجربے، داخلی کرب، محبت کی وسعت اور وجودی سوالات کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کی زبان سادہ مگر اثر انگیز ہے، اور ان کا لہجہ کہیں نرم، کہیں تلخ اور کہیں اعترافی ہو جاتا ہے۔ یہی تنوع انہیں ایک منفرد شاعر کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

''صدائے کُن'' اس بات کی علامت ہے کہ وہ روایت اور جدید احساس کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر کر رہے ہیں جہاں ماضی کی جمالیات اور حال کی تلخ حقیقتیں ایک ساتھ سانس لیتی ہیں۔ ان کی شاعری قاری کو صرف متاثر نہیں کرتی بل کہ سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے اندر جھانکنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

999 ٹریلین ڈالر سے آگے کی حقیقت

انسان... علم... شعور... اور اصل دولت کی تلاش

علامہ عبدالستار عاصم کی شہرہ آفاق تصنیف

بعض کتابیں صرف کاغذ پر لکھی ہوئی سیاہی نہیں ہوتیں بل کہ زمانوں کی سوچ، صدیوں کے تجربات اور انسانیت کے اجتماعی شعور کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ کچھ تحریریں وقتی شہرت کے لیے لکھی جاتی ہیں اور وقت کے گردوغبار میں گم ہو جاتی ہیں، مگر بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو نسلوں کے ذہنوں میں چراغ روشن کر دیتی ہیں۔ ''999 ٹریلین ڈالر'' بھی ایک ایسی ہی غیر معمولی، فکر انگیز اور شعور آفرین تصنیف ہے جسے محض ایک کتاب کہنا شاید اس کے مقام کے ساتھ انصاف نہ ہو۔

یہ دراصل علم، فکر، تاریخ، فلسفہ، انسانیت، قیادت، روحانیت اور انسانی عظمت کا ایسا حسین امتزاج ہے جو قاری کو اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کتاب کا عنوان ہی انسان کے ذہن میں ایک ہلچل پیدا کرتا ہے۔ ''999 ٹریلین ڈالر'' سن کر بظاہر ذہن میں دولت کے انبار، عالمی خزانے، سرمایہ دارانہ طاقتیں اور دنیا پر حکومت کرنے والے مالیاتی ادارے گردش کرنے لگتے ہیں، مگر علامہ عبدالستار عاصم نے نہایت خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ یہ عنوان دراصل ایک استعارہ ہے۔ ایسا استعارہ جو انسان کو یہ باور کرواتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت نہ سونا ہے، نہ چاندی، نہ محلات اور نہ بینک بیلنس... بل کہ اصل دولت انسان کا علم، کردار، شعور، فکر اور انسانیت کے لیے اس کا مثبت اثر ہے۔

عامر عباس ناصر اعوان

آج کا انسان ایک عجیب فکری انتشار کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کامیابی کو صرف دولت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا ہے۔ بینک بیلنس کو عزت، جائیداد کو وقار، گاڑیوں کو مرتبہ اور آسائشوں کو کامیابی سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر تاریخ بار بار یہ حقیقت دہراتی ہے کہ دنیا کی اصل طاقت ہمیشہ عظیم انسانوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اگر دولت ہی عظمت کا معیار ہوتی تو آج سقراط کو کون یاد رکھتا؟ اگر خزانے ہی انسان کو امر کرتے تو رومی کی تعلیمات صدیوں بعد بھی دلوں کو کیوں گرماتیں؟ اگر جائیداد ہی اصل پہچان ہوتی تو مرزا غالب آج بھی انسان کے جذبات کی ترجمانی کیوں کر رہے ہوتے؟

علامہ عبدالستار عاصم نے اپنی اس تصنیف میں انہی سوالات کے گرد ایک ایسا فکری جہان آباد کیا ہے جہاں قاری محض مطالعہ نہیں کرتا بل کہ سوچنے، محسوس کرنے اور اپنی حقیقت کو پہچاننے لگتا ہے۔

یہ کتاب دراصل ان عظیم شخصیات کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے جنھوں نے اپنے اپنے میدانوں میں وہ خدمات انجام دیں جن کی بدولت انسانیت نے ترقی کی نئی راہیں تلاش کیں۔ آئن سٹائن کا ذکر آتے ہی قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے کائنات کے دروازے اس پر کھلنے لگے ہوں۔ ایک ایسا شخص جس نے وقت، توانائی اور فاصلوں کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ آئزک نیوٹن کا نام تدبر اور تحقیق کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ گلیلیو گلیلی سچائی کے استعارے کی صورت دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے مخالفت، اذیت اور پابندیوں کے باوجود حقیقت کا دامن نہ چھوڑا۔ فکولا ٹیسلا کا ذکر انسان کو تخیل کی طاقت کا احساس دلاتا ہے کہ ایک خواب دیکھنے والا شخص پوری دنیا کی ٹیکنالوجی بدل سکتا ہے۔

طب کے میدان میں ابن سینا کا تذکرہ مسلمانوں کے علمی عروج کی سنہری یاد دلاتا ہے۔ ان کی ''القانون'' صدیوں تک دنیا کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ ایڈورڈ جینر، الیگزینڈر فلیمنگ اور لوئی پاسچر جیسے لوگ اس حقیقت کی روشن مثال ہیں کہ ایک انسان کی تحقیق پوری انسانیت کی زندگی بدل سکتی ہے۔ اگر جراثیم کے نظریے پر تحقیق نہ ہوتی تو شاید آج بھی دنیا بیماریوں کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہوتی۔

فلسفے کے میدان میں الفارابی، ابن خلدون، ایمانوئل کانٹ اور ژاں پال سارتر جیسے

مفکرین کا ذکر اس کتاب کو فکری گہرائی عطا کرتا ہے۔ یہ لوگ انسان کو سوچنے، سوال کرنے اور حقیقت کی تلاش کا حوصلہ دیتے ہیں۔ ابن خلدون کا نام پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ بعض ذہن اپنے زمانے سے صدیوں آگے سوچتے ہیں۔

ادب کی دنیا میں ولیم شیکسپیئر، لیو ٹالسٹائی، گیبریل گارشیا مارکیز اور انتون چیخوف جیسے عظیم نام اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ لفظوں کی طاقت تلواروں سے کہیں زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ سلطنتیں ختم ہو جاتی ہیں مگر ادب دلوں پر حکومت کرتا رہتا ہے۔ شیکسپیئر کے کردار آج بھی زندہ محسوس ہوتے ہیں، ٹالسٹائی کے ناول روح میں اتر جاتے ہیں، مارکیز تخیل اور حقیقت کے درمیان ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں جبکہ چیخوف انسان کی نفسیات کو حیرت انگیز گہرائی سے بیان کرتے ہیں۔

سیاست اور قیادت کے میدان میں نیلسن منڈیلا، محمد علی جناح، ونسٹن چرچل اور کوفی عنان جیسی شخصیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ قیادت صرف اقتدار کا نام نہیں بل کہ قربانی، بصیرت اور ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ نیلسن منڈیلا برسوں قید میں رہنے کے باوجود نفرت کے بجائے محبت اور مفاہمت کا پیغام دیتے ہیں۔ محمد علی جناح ایک ایسی قیادت کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں جس نے ایک منتشر قوم کو خواب اور منزل عطا کی۔

اسلامی فکر کے میدان میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا ذکر اس کتاب کو ایک خاص فکری وقار بخشتا ہے۔ انھوں نے اسلام کو محض عبادات تک محدود نہیں رکھا بل کہ اسے ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا۔

ٹیکنالوجی کی دنیا میں بل گیٹس، اسٹیو جابز، مارک زکر برگ اور ایلون مسک کا ذکر جدید دور کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو اجاگر کرتا ہے۔ ان لوگوں نے دنیا کو ڈیجیٹل انقلاب سے روشناس کروایا اور انسانی زندگی کے انداز بدل ڈالے۔ اسٹیو جابز کا وژن، بل گیٹس کی حکمتِ عملی اور ایلون مسک کا تخیل یہ ثابت کرتا ہے کہ خواب دیکھنے والے لوگ دنیا کا مستقبل لکھتے ہیں۔

روحانیت اور انسانیت کے میدان میں مولانا رومی اور مدر ٹریسا کا ذکر کتاب کو ایک روحانی خوشبو عطا کرتا ہے۔ رومی محبت، برداشت اور خدا شناسی کا درس دیتے ہیں جبکہ مدر ٹریسا انسانیت کی خدمت کا ایسا استعارہ بن جاتی ہیں جو مذہب، نسل اور

زبان کی تمام حدیں توڑ دیتا ہے۔

کتاب کا ایک نہایت خوبصورت اور قابلِ تحسین پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ عبدالستار عاصم نے پیغمبروں، صحابہ کرام اور اولیاء اللہ کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ انھوں نے بڑی فکری دیانت کے ساتھ وضاحت کی کہ ان مقدس ہستیوں کا مقام عام انسانوں سے کہیں بلند اور ماورا ہے، اس لیے انھیں اس فہرست میں شامل کرنا ان کے مرتبے کے شایانِ شان نہ تھا۔ یہ وضاحت کتاب کے علمی وقار کو مزید بلند کر دیتی ہے۔

مصنف نے نہایت خوبصورتی سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دنیا کی اصل دولت انسان ہے۔ 999 ٹریلین ڈالر دراصل ایک ایسا استعارہ ہے جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اس کی اصل قیمت اس کے کردار، علم، خدمت، فکر اور انسانیت کے لیے اس کے اثر میں پوشیدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان جتنا مادی طور پر ترقی کر رہا ہے اتنا ہی روحانی اور فکری طور پر خالی ہوتا جا رہا ہے۔ گھروں کی دیواریں بلند ہو رہی ہیں مگر سوچیں پست ہوتی جا رہی ہیں۔ آسائشیں بڑھ رہی ہیں مگر سکون کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے دور میں ''999 ٹریلین ڈالر'' جیسی کتاب امید کا چراغ بن کر سامنے آتی ہے۔

یہ کتاب قاری کو احساسِ کمتری نہیں بل کہ احساسِ عظمت دیتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ اگر ایک مفکر پوری دنیا کی سوچ بدل سکتا ہے، اگر ایک سائنسدان کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھا سکتا ہے، اگر ایک ادیب صدیوں تک دلوں پر حکومت کر سکتا ہے، اگر ایک مصلح قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے، تو پھر ہر انسان کے اندر بھی ایک روشنی موجود ہے جسے جگانے کی ضرورت ہے۔

یہ کتاب نوجوان نسل کے لیے ایک فکری تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا نوجوان سوشل میڈیا کی مصنوعی چمک دمک میں اپنی اصل صلاحیتوں سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔ اسے فوری شہرت چاہیے، مختصر راستے چاہیے اور بغیر محنت کے کامیابی چاہیے۔ ''999 ٹریلین ڈالر'' نوجوان کو یہ سبق دیتی ہے کہ حقیقی عظمت صبر، مطالعہ، تحقیق، مسلسل جدوجہد اور اعلیٰ کردار سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ کتاب انسان کو کتابوں سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ یہ احساس دلاتی ہے کہ مطالعہ صرف امتحان پاس کرنے کے لیے نہیں بل کہ

شخصیت سنوارنے کے لیے ضروری ہے۔ جس قوم کے ہاتھوں میں کتاب آ جائے، اس کے مقدر بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

آج ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم نے کتاب کو زندگی سے نکال دیا ہے۔ گھروں میں مہنگے موبائل موجود ہیں مگر اچھی کتابیں نہیں۔ بچوں کے ہاتھوں میں سکرینیں ہیں مگر مطالعے کی عادت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوچ سطحی، برداشت کمزور اور شعور محدود ہوتا جا رہا ہے۔

''999 ٹریلین ڈالر'' ایسی کتاب ہے جو صرف پڑھی نہیں جاتی بل کہ انسان کے اندر اترتی چلی جاتی ہے۔ اس کے صفحات قاری کی سوچ بدلنے لگتے ہیں۔ وہ دولت کی حقیقت اور علم کی عظمت کو نئے زاویے سے سمجھنے لگتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کسی گھر میں اچھی کتابیں موجود ہوں تو وہ گھر کبھی فقیر نہیں رہتا۔ علم والا گھر ہمیشہ امیر ہوتا ہے چاہے اس کی دیواریں سادہ ہوں۔ کیونکہ علم انسان کو سوچ دیتا ہے، سوچ مقصد دیتی ہے، مقصد جدوجہد پیدا کرتا ہے اور جدوجہد انسان کو عظمت تک پہنچا دیتی ہے۔

''999 ٹریلین ڈالر'' ہر نوجوان کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، ہر استاد کی لائبریری میں ہونی چاہیے، ہر طالب علم کی میز پر ہونی چاہیے اور ہر اس گھر میں ہونی چاہیے جہاں والدین اپنی اولاد کو صرف جائیداد نہیں بل کہ شعور بھی دینا چاہتے ہوں۔

یہ کتاب دراصل ایک ایسا فکری خزانہ ہے جس کی قیمت کسی کرنسی میں ادا نہیں کی جا سکتی۔ یہ انسان کو انسان بننے کا شعور دیتی ہے، خواب دیکھنے کا حوصلہ دیتی ہے، مطالعے کی شمع روشن کرتی ہے اور نوجوانوں کو مایوسی سے نکال کر امید کی طرف لے جاتی ہے۔

علامہ عبدالستار عاصم نے اس تصنیف کے ذریعے صرف ایک کتاب نہیں لکھی بل کہ آنے والی نسلوں کے لیے علم، فکر، تحقیق، شعور اور انسانیت کا ایک روشن مینار تعمیر کیا ہے۔

اور شاید یہی کسی کتاب کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ انسان کو وقتی لطف نہیں بل کہ مستقل شعور عطا کرے۔

بلاشبہ جس گھر میں ''999 ٹریلین ڈالر'' موجود ہو، وہ گھر علم کی دولت سے مالا مال ہے...

اور علم سے بڑا کوئی خزانہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

پاکستانی سرّی ادب کے اسرارِ فریدی و رموزِ علی عمرانی

دنیا کی بالعموم اور مغرب کی بالخصوص بیشتر زبانوں میں جاسوسی یا سرّی ادب کو فکشن کی باقاعدہ شاخ گردانا جاتا ہے۔ انگریزی زبان پر نظر ڈالیں تو ہزاروں کے حساب سے بیسٹ سیلر ناولوں کی ایک طویل قطار دکھائی دیتی ہے۔ شرلاک ہومز متعارف کرانے والے آرتھر کونن ڈائل اور جیمز بانڈ سیریز کے خالق آئن فلیمنگ کے علاوہ جیمز ہیڈلے چیز، ارل سٹینلے گارڈنر اور اگاتھا کرسٹی سے لے کر ڈین براؤن، سڈنی شیلڈن، انتھونی ہوروٹز اور ٹانا فرنچ سمیت جاسوسی فکشن کے متعدد مصنفین گنوائے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے آئن فلیمنگ اور اگاتھا کرسٹی کو اضافی شہرت اس لیے بھی ملی کہ ان کے ناولوں پر زبردست بزنس کرنے والی فلمیں بھی بنائی گئیں۔ اگاتھا کرسٹی کے ناول ''مرڈر آن اورینٹ ایکسپریس'' پر ایک سپرہٹ فلم پہلے 1974 اور پھر 2017 میں بنی اور دونوں نے باکس آفس پر خوب بزنس کیا۔ کرسٹی کے کچھ اور ناولوں اور افسانوں/شارٹ سٹوریز پر 30 کامیاب فلمیں بنائی گئیں۔ ان کے تخلیق کردہ ہیرو ہرکیول پوئرو کو اپنے دور میں شرلاک ہومز اور جیمز بانڈ جیسی شہرت نصیب ہوئی۔

اسی طرح آئن فلیمنگ کی جیمز بانڈ سیریز پر لکھے گئے ناولوں کی تعداد 12 ہے جبکہ اسی کردار پر افسانوں/شارٹ سٹوریز کے دو مجموعے الگ سے شائع ہوئے۔ تاہم اس سیریز نے وہ آفاقی شہرت حاصل کی کہ اس پر کُل 27 فلمیں بنائی جا چکی ہیں جن میں سے آخری فلم 2021 میں ریلیز ہوئی۔ 1964 میں آئن فلیمنگ کی وفات کے بعد کئی ناول نگاروں نے بانڈ سیریز کی فلموں کے سکرپٹ کے لیے ناول لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان میں کنگز لے ایمس، کرسٹوفر وڈ، جون گارڈنر اور ریمنڈ بینسن وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ بانڈ سیریز کی تازہ ترین فلم ''بانڈ 26'' کی شوٹنگ ان دنوں جاری ہے اور یہ فلم 2027 یا 2028 میں پردۂ سیمیں پر نمائش کے لیے پیش ہوگی۔

افتخار الحق

اسی تسلسل میں بیسویں صدی کے اوائل سے اب تک فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں قابلِ رشک شہرت کے حامل کئی جاسوسی ناول لکھے جا چکے ہیں۔ بعینہٖ جے کے رولنگ کی ہیری پوٹر سیریز پر لکھے گئے ناولوں پر 8 سپر ہٹ فلمیں بن چکی ہیں اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اس سیریز میں طلسمِ ہوش رُبا کی جھلکیاں حیران کن حد تک کثرت سے ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اگر اردو میں طلسمِ ہوش ربا پر فلمیں بنائی جاتیں تو ان کی مقبولیت کا گراف کتنا بلند ہوتا۔

مغرب میں جاسوسی ادب کے اس مختصر جائزے کے بعد اب مشرق میں اردو زبان کی طرف چلتے ہیں۔ اردو میں ناول نگاری مغرب سے درآمد عمل ہونے کے سبب قدرے تاخیر سے شروع ہوئی۔ ابتدائی ناول مختلف سماجی موضوعات پر لکھے گئے اور اردو کی خوش نصیبی کہ بیسویں صدی تک کچھ ناول تو عظیم کہلانے کے بجا طور پر مستحق ٹھہرے، جیسے خدا کی بستی، اداس نسلیں، علی پور کا ایلی اور آگ کا دریا وغیرہ۔ تاہم جاسوسی ناول نگاری کی ابتدا کافی دیر بعد ہوئی۔ ظفر عمر کو اس سلسلے کا بانی کہا جاتا ہے گو کہ انھوں نے طبع زاد چند ایک ناول لکھے جیسے نیلی چھتری اور بہرام کی واپسی۔ اس کے بعد پنڈت کشور چند اور طالب بنارسی نے انگریزی ناولز کے تراجم کیے۔ تاہم ظفر عمر کے بعد شہرت پانے والے جاسوسی ناول نگار اکرم الہ آبادی تھے جنھوں نے متعدد کتب لکھیں لیکن وہ غیر معمولی طور پر مشہور نہ ہوئے کیونکہ اسی دور میں اردو کے سرّی ادب کے افق پر سب سے چمک دار ستارہ اسرار احمد کے نام سے ابھرنے لگا تھا۔ اسرار احمد نے ابنِ صفی کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور شہرت کی دیوی ان پر جلد ہی مہربان ہونے لگی۔ ان کا تعلق خالص ادبی خانوادے سے تھا اور انھوں نے باقاعدہ شاعری بھی کی۔ والد صفی اللہ زمیندار تھے لیکن ماموں نوح ناروی نہ صرف بہت معروف شاعر تھے بل کہ داغ دہلوی کے شاگرد بھی تھے۔ نوح ناروی کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ کلام، ابنِ صفی کے بیٹے جناب احمد صفی کے مطابق، پیر صاحب گولڑہ شریف کے پاس محفوظ پڑا ہے اور احمد صفی اس کی ایک بار زیارت بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ ابنِ صفی شاعری میں اکثر نوح ناروی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ وہی نوح ناروی جنھوں نے اپنے تخلص کی ذومعنویت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ مشہور شعر کہا تھا:

کب تک یہ سیلِ رنج و غم کب تک یہ آہ و زاریاں
دنیا فنا ہو جائے گی اے نوح بس اے نوح بس

غالباً اتنے عمدہ ادبی ماحول کا اثر تھا کہ ابنِ صفی نے اردو ادب کی روایتی اصناف میں کچھ تنوع لانے کی شعوری اور کامیاب کاوش کی۔ محض بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ابنِ صفی نے جب عمران سیریز اور جاسوسی دنیا نام کے دو سلسلے شروع کیے تو ان کے کردار علی

عمران اور کرنل فریدی آنے والے وقتوں کے لیے امر سے ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ تو ابنِ صفی کے قلم کا جادو تھا اور دوسری وجہ یہ کہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجانے کتنے ہی اور مصنفین نے ان کرداروں پر ان گنت ناول لکھ ڈالے گو کہ ان سب کا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا:

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

.....

نجمہ صفی، نغمہ صفی اور مظہر کلیم سمیت کتنے ہی فکشن نگاروں نے ابنِ صفی کے دونوں سلسلوں، عمران سیریز اور جاسوسی دنیا، کی پیروی کرتے ہوئے خوب پیسہ بنایا جبکہ یہ کھلم کھلا چربہ/سرقہ تھا۔ بہرحال اس تمام عمل نے ابنِ صفی کو صرف ناول نگار کے مرتبے پر ہی فائز نہ رہنے دیا بلکہ انھیں رجحان ساز کے سنگھاسن پر بھی بٹھا دیا۔ ابنِ صفی نے اپنے تمام ناولوں میں شین قاف کا خیال رکھتے ہوئے املا اور قواعد کی اغلاط سے دامن بچائے رکھا۔ دیگر مصنفین کی بابت اتنے وثوق سے شاید یہی بات کہنا محال ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں سوشل میڈیا، رومن رسم الخط میں اردو لکھنے، اور نجی ٹی وی چینلز پر کام کرنے والوں کے لیے درست تلفظ کا بھرپور اہتمام نہ کرنے وغیرہ کی بدعات نے ابھی جڑیں نہیں پکڑی تھیں۔ اس کے علاوہ ابنِ صفی کو سری ادب میں اولین ترین سائی فائی / سائنس فکشن باقاعدہ طور پر متعارف کرانے کا کریڈٹ دینا کسی لحاظ سے مبالغہ آرائی یا ناانصافی کا عمل نہ ہوگا گو کہ اکرم الہ آبادی اور خان محبوب طرزی بھی کم و بیش اسی دور میں سائنس فکشن کے ابتدائی اور نمایاں لکھاریوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ ابنِ صفی اس میدان کے کہیں زیادہ قدآور اور منجھے ہوئے کھلاڑی ثابت ہوئے۔

آج کے دور کی روبوٹکس، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، خلائی سائنس اور جدید ترین حساس نظاموں سے لیس گاڑیاں اور ایسے دیگر گیجٹس، یہ سبھی جدید ایجادات ہمیں ابنِ صفی کے ہاں جابجا ملتی ہیں۔ کہیں کہیں ٹائم ٹریول کی جھلکیاں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ 1970 کی دہائی آنے تک ابنِ صفی برقناطیسیت / الیکٹرومیگنیٹزم سے متعلق لہروں اور سگنلز کے علاوہ زہریلی گیس اور دیگر کیمیائی وحیاتیاتی ہتھیاروں

Chemical and biological weapons / warfare

کا ذکر اپنے کئی ناولوں میں کر چکے تھے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے انھی فرضی اشیا کو لیزر گن وغیرہ کی صورت نہ صرف میدانِ جنگ میں بل کہ روزمرہ زندگی میں انسانی صحت کے حوالے سے عملی طور پر دیکھا۔ اردو زبان کے مخصوص مزاج کے سبب مغربی

جاسوسی فکشن کے بڑے کرداروں کے مقابل ابنِ صفی کی عمران سیریز کا کردار نہ صرف ایک سپر ہیرو کے طور پر مقبول ہوا بل کہ اپنی نفیس حسِ مزاح اور کاٹ دار طنزیہ جملوں نے بھی اسے آفاقی شہرت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ ابنِ صفی کی حیات میں ہی اگاتھا کرسٹی نے اپنے ایک ہوائی سفر کے دوران کراچی ایرپورٹ پر مختصر قیام کے دوران ابنِ صفی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور انھیں ایشیا کا واحد اور یجنل جاسوسی ناول نگار قرار دیا۔

ابنِ صفی نے کل 245 ناول تحریر کیے جن میں سے 120 عمران سیریز پر اور باقی 125 جاسوسی دنیا کی سیریز پر ہیں۔ اتنے زیادہ ناولوں کے علاوہ متفرق موضوعات پر مضامین اور افسانے بھی تحریر کیے۔ اپنی مشہور جاسوسی سیریز کے علاوہ تزک دوپیازی، معزز کھوپڑی، پرنس چلی، بلدران کی ملکہ، شمال کا فتنہ، قابلِ اعتراض تصویر اور اب تک تھی کہاں جیسے متنوع عنوانات کی کتب بھی ابنِ صفی کے زرخیز ذہن کی کرامات ہیں۔ ان عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر مزاح کا وہی رنگ ہوگا جو ان کے مشہور ہیرو علی عمران کے ہاں ملتا ہے۔ خالص جاسوسی ادب کی دو بڑی مشہور سیریز کی بابت ترجیحات کے لحاظ سے ان کے قارئین کی تقسیم بہت دلچسپ ہے۔ کچھ کو صرف اور صرف جاسوسی دنیا کے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید پسند ہیں جب کہ کئی دیگر کو عمران سیریز کے علی عمران، سپرنٹنڈنٹ پولیس فیاض، ایکس ٹو اور باورچی سلیمان کی ٹیم بے حد پسند ہے۔ اسی ٹیم میں ہلکا سا رومانس کا تڑکا جولیا کی صورت لگایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ بیشتر قارئین کو دونوں سیریز اپنی اپنی جگہ پسند ہیں۔ کاش کوئی گیلپ سروے کی طرز پر ابنِ صفی کے ناولوں کی قرات کا تناسب یعنی Readership percentage متعین کر سکے۔

اس سے سنزی ادب کے قارئین کی نوعیت کی بابت بھی کچھ معلومات میسر ہونے کا امکان ہے۔ 1974 میں ان کے عمران سیریز کے ناول ''بے باکوں کی تلاش'' پر ایک فلم ''دھماکہ'' بنائی گئی تھی جو کچھ خاص بزنس نہ کر سکی۔ بالکل سیریز کی طرح عمران سیریز یا جاسوسی دنیا کی سیریز پر بہت کامیاب فلمیں بنائی جا سکتی تھیں لیکن بدقسمتی سے ہماری فلم انڈسٹری کے پاس ہالی ووڈ جیسی سہولیات، حکومتی سرپرستی اور وافر سرمایہ کاری نہ ہونے کے سبب بات دھماکہ سے آگے نہ بڑھ پائی۔ ان عوامل کے علاوہ اور ان سے جُڑا ہوا ایک بہت اہم عنصر یہ ہے کہ اردو ادب میں سائنس فکشن لکھنے کا رواج ابتدائی تاریخ میں شاید صفر کے قریب ہے۔ رفتہ رفتہ کچھ ادبا اس طرف مائل تو ہوئے لیکن شاید مقبولیت کی اس منزل سے یہ لوگ بھی ابھی خاصے دور ہیں کیونکہ دیگر سماجی موضوعات پر شہکار ادب کا حجم اتنا ہے کہ مراغ رسانی اور سائی فائی پر لکھا گیا فکشن، خاص طور پر

ناول، اس کے آگے ابھی بونا ہی لگتا ہے۔ اگر تاریخی تناظر میں بغور تجزیہ کیا جائے تو جنوبی ایشیا کے ممالک سائنس کے میدان میں یوں بھی صنعتی طور پر بے پناہ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں پسماندہ رہے ہیں۔ یورپ اور شمالی امریکہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں گزشتہ چند صدیوں میں جو معرکے سر کیے ہیں، انھوں نے ان ممالک اور تیسری دنیا کے درمیان عدم مساوات خوفناک حد تک بڑھا دی ہے۔ لہٰذا اس پسماندگی کے ساتھ جنوبی ایشیائی ممالک کی معاشی پسماندگی اور سائی فائی پر مبنی ادبی تحریروں کے مابین تناسب معکوس خاصا منطقی اور متوقع سا ہے۔ سائنسی موضوعات پر فکشن کا بڑا حصہ اسی لیے ترجموں کی صورت اردو ادب کا سرمایہ بنا۔ اس موضوع پر طبع زاد ناولوں کی تعداد مایوس کن حد تک کم ہے۔

سرّی ادب کو ہمارے مرکزی ادبی حلقوں کی طرف سے پذیرائی نہ ملنا ایک بہت اہم موضوع ہے اور اس کا بڑا سبب بھی وہی ہے جو اوپر لکھی سطور میں بیان ہوا ہے۔ بیشتر اہلِ قلم اسے بطور فکشن وہ مقام دینے پر متذبذب ہیں جو کلاسیکی اور جدید دور کے افسانوں اور ناولوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی کے اواخر تک ڈائجسٹی ادب کو معیاری ادب میں کم کم ہی شمار کیا گیا۔ سب رنگ اور اکا دکا اور ڈائجسٹوں میں اردو کے کرشن چندر، منٹو، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی جبکہ مغرب کے ایڈگر ایلن پو، سمرسیٹ ماہم، مارک ٹوئین اور موپساں کی تحریروں کے استثنا کے ساتھ بیشتر اوسط درجے کے ادیب جگہ پاتے رہے۔ اس لیے نقوش، فنون، ادبِ لطیف اور ماہِ نو جیسے غیر ڈائجسٹی جرائد کو باشعور اور اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل قارئین کی طرف سے ہمیشہ زیادہ پذیرائی ملتی رہی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ ڈائجسٹی اور غیر ڈائجسٹی ادب کی یہی تقسیم اردو کے سرّی ادب کو مسلمہ ادبا کی طرف سے سندِ قبولیت کے اجرا میں مزاحم رہی۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ چوٹی کے نقاد اور محققین اس بابت کیا حکم لگاتے ہیں۔ کلاسیکی دور کے حالی اور شبلی نعمانی جیسے ناقدین نے سرّی ادب کی بابت حوصلہ شکن رویہ اپنایا۔ اس رویے کا جواز بھی تھا کہ یہ شخصیات دبستانِ سرسید سے وابستگی کے سبب ادب برائے مقصد کے علمبردار تھیں۔

اسی طرح ترقی پسند دور کے احتشام حسین اور ان کے معاصر نقادوں نے ایک مخصوص ادبی تحریک کا حصہ ہونے کے سبب ادبی اصناف کو پرکھنے کی بابت جو سخت اور غیر لچکدار پیمانے مقرر کر رکھے تھے ان پر سرّی ادب پورا اترنے سے قاصر تھا۔ ان اصحاب کے خیال میں ایسی تحریریں تخیل کی بلندیِ پرواز سے عاری ہیں اور محض تجسس اور سنسنی خیزی کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ دائرہ ادب سے خارج سمجھی گئیں۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ تخیل کی بلند پروازی میں کیا سائنسی مستقبل

بنی شامل نہیں ہے۔ غالباً ترقی پسندوں کے وضع کردہ معیارات کا پس منظر اور محرکات مدِ نظر رکھے جائیں تو ان کا مخالفانہ رویہ سمجھنا مشکل نہیں۔

البتہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ بڑے ناقدین کا سرّی ادب کی بابت رویہ نمایاں طور پر تبدیل ہونے لگا۔ شمس الرحمان فاروقی نے سرّی ادب کو باقاعدہ صنفِ نثر اس بنیاد پر تسلیم کیا ہے کہ وہ تحریریں جو قاری کو اپنے طلسم میں تادیر جکڑے رکھیں اور قواعد وغیرہ کی اغلاط سے پاک ہوں، انھیں ادب کے منطقے میں جگہ پانے کا پورا استحقاق ہے۔ صرف یہی نہیں بل کہ فاروقی صاحب نے ابنِ صفی کی مدّاحی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کے جاسوسی دنیا سیریز کے 4 ناولوں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔ ابنِ صفی کے ایک اور ناول کو بلال تنویر نے انگریزی قالب میں ڈھالا ہے اور یہ واحد ناول عمران سیریز کا ہے۔ حال ہی میں جاپانی صنفِ سخن ہائیکو پر ایف سی کالج لاہور میں ایک اہم سیمینار ہوا۔ اس میں سینئر اور معتبر شاعر و نثر نگار جناب غلام حسین ساجد نے ایک یادگار جملہ کہا: ''اردو ادب کی مختلف اصناف کے کما حقہ تراجم نہ ہونے کے سبب اس کا عالمی سطح پر تعارف نہیں ہو سکا جبکہ ٹیگور کو ایک مترجم ہی نوبیل پرائز کی منزل تک لے گیا۔'' غلام حسین صاحب کی رائے کے تسلسل میں یہی کہوں گا کہ اقبال کو جرمنی، ایران اور افغانستان میں جبکہ فیض کو روس میں زبردست شہرت ملنے میں بھی تراجم نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ایران اور افغانستان میں اقبال کی شہرت کی اضافی وجہ ان کی فارسی شاعری بھی ہے۔ ممکن ہے ہمارے مروجہ معیاری ادب کے ہمراہ سرّی ادب کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو مقامی اور عالمی ادبی حلقوں میں اس صنفِ ادب کا پاکستانی روپ بھی پذیرائی پانے میں کامیاب ہو جائے۔

مشہور ماہرِ تعلیم اور اہلِ قلم فقیر سید اعجاز الدین کی زوجہ محترمہ شہناز اعجاز الدین نے 2009 میں طلسمِ ہوشربا کا انگریزی ترجمہ کیا جو تقریباً 925 صفحات پر مشتمل ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر محترمہ شہناز اعجاز اور جناب شمس الرحمان فاروقی کی پیروی میں کچھ اور اہلِ قلم ابنِ صفی کے زیادہ سے زیادہ ناولوں کا انگریزی وغیرہ میں ترجمہ کر کے پاکستانی ادب کو عالمی ادب کے مقابل لانے کا نیک عمل کریں۔ اس بابت رضا کار افراد کے علاوہ اکادمی ادبیات جیسے سرکاری ادارے زبردست کردار ادا کر سکتے ہیں۔

فاروقی صاحب کی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی اور دیگر جدید ناقدین نے سرّی ادب کو بطورِ خاص ابنِ صفی کے حوالے سے باقاعدہ ادبی فکشن کے طور پر اس لیے تسلیم کیا ہے کہ ان کے ناولوں میں سوقیانہ پن یا جنسی جذبات ابھارنے کا ماحول نہیں ملتا اور اس کے علاوہ بے تحاشا مار دھاڑ کے عناصر کی بھرمار نہیں ہے۔ یوں اسے سنجیدہ اور فکاہیہ فکشن کے بین

بین تفریحی ادب کے طور پر تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ جیسے سماجی و معاشی مسائل، انسانی حقوق و استحصال، جنسی، نسلی و لسانی امتیاز کے علاوہ مقامی اور عالمی سیاسی بحرانوں پر المیہ اور طربیہ ادب نثر اور شاعری دونوں صورتوں میں تخلیق کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ابنِ صفی کی طرز پر معیاری جاسوسی ادب تخلیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو کچھ بعید نہیں کہ مسابقت کی فضا پیدا ہو اور تحریر و تخلیق کا معیار بہتری کی طرف مائل ہو۔

آخر میں اس بات کا تجزیہ بھی ضروری ہے کہ ابنِ صفی کا باقاعدہ چربہ کرنے والے درجنوں مصنفین مقبولیت کے وہ زینے کیوں طے نہ کر سکے جو ابنِ صفی کا مقدر بنے۔ کچھ تجزیہ نگار مظہر کلیم اور ان کے بعد اشتیاق احمد کو بھی سری ادب کے پائے کے مصنفین گردانتے ہیں لیکن میرے مطالعے کے مطابق ان کے ہاں زبان کا وہ معیار اور اختراعیت کی وہ بلندی دور دور تک نہیں ملتی جو ابنِ صفی کو ودیعت ہوئی۔ یہیں ہمیں اس بنیادی نکتے کا ادراک ہوتا ہے کہ سری ادب کو اعلیٰ درجے کے فکشن نگاروں کی طرف سے سندِ قبولیت کیوں نہیں مل پائی۔ اگر ابنِ صفی جیسی ستھری اور معیاری زبان لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو جاتی تو انگریزی کی طرح اردو میں سری فکشن نگاری کا تسلسل بھی رہتا اور روز بروز معیار میں بھی بہتری آنے کا امکان ہوتا۔ یوں بھی حال ہی میں مقبول ہوتی ہوئی مختصر فکشن نگاری جو مائیکرو فکشن، فلیش فکشن اور سو لفظوں کی کہانی وغیرہ کی صورت فروغ پا رہی ہے، اس میں بھی تفریح، تجسس، تحیر، سنسنی خیزی اور خال خال ایکشن کے عناصر تفریحی ادب کا ماحول پیدا کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال سری ادب کے لیے بہت نیک شگن ہے اور اس کو باقاعدہ فکشن نگاری کی ایک شاخ ثابت کرتی جا رہی ہے۔ القصہ یہ کہ مائیکرو فکشن اور اسی قبیل کی مختصر فکشن نگاری کی صورت جاسوسی ادب کی صنف کو نہ صرف زندہ رکھا جا سکتا ہے بلکہ اس کے نہایت صاحب مطالعہ مصنفین کی اچھی خاصی ٹیم تیار کی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں بہت معروف شاعر شہزاد نیر کا مائیکرو فکشن کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی چل رہی ہے'' کے عنوان سے زبردست مقبولیت پا چکا ہے۔ ایسے مجموعے اگر تسلسل سے منظرِ عام پر آتے رہے تو قوی امید ہے کہ ابنِ صفی نے جس سلسلے کی کامیاب ابتدا کی تھی، وہ ان کی وفات کے چار ساڑھے چار عشروں کے بعد ایک نئے اور منفرد رنگ میں ایک اور شاہراہِ نثر پر سفر کا آغاز کرے گا۔ لگتا ہے اس بابت وہ اپنے ایک شعر میں شاید کسی وجدانی کیفیت میں کچھ ایسی ہی پیش گوئی کر گئے تھے:

کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

☆☆☆☆☆

تین سلطنتوں کی داستان

تین سلطنتوں کی کہانی چین کی مشہور کلاسیکی تھی اور تاریخی داستان ہے، جس کا اُردو ترجمہ جناب ظہور احمد صاحب نے کیا ہے جو پاکستان کے سفارت کار ہیں۔ آپ نے نہ صرف چین میں سفارتی ذمہ داریاں نبھائیں بل کہ بڈاپسٹ، لندن، منیلا اور سویڈن میں بھی پاکستان کی نمائندگی کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ ایک منجھے ہوئے سفارت کار ہیں۔ آپ وزارت خارجہ پاکستان میں ایڈیشنل سیکرٹری اور شنگھائی تعاون تنظیم کے نیشنل کوآرڈینیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ چین میں تین سالہ قیام کے دوران آپ نے چینی زبان وادب تہذیب وثقافت اور معاشرتی روایات وسماجی اقدار کا بغور مشاہدہ کیا۔ آپ نے کمال خوبی سے اس پھیلی ہوئی داستان کا چینی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

ترجمہ نگاری نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ مترجم کے لیے اصل زبان، تہذیب و ثقافت، رسم ورواج، سماجی ومعاشرتی اقدار سے آگہی ہونا، اچھا ترجمہ کرنے کی شرط اوّلین ہے۔ جناب ظہور احمد نے نہ صرف چینی زبان پر عبور حاصل کیا بل کہ مختلف حوالوں سے چینی ثقافت اور تہذیبی روایات کو سمجھنے کے لیے شعوری کوشش کی۔ یہ داستان اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ ظہور احمد نے اس کلاسیکی اور تاریخی داستان کو اردو زبان میں منتقل کرکے نہ صرف پاک چین دوستی کے اٹوٹ رشتے کو

داستان گو: لوگوان چونگ
مترجم: ظہور احمد
تحریر: سید اظہار الحسن بخاری

مضبوط کیا بل کہ پاکستانی قارئین کو چینی تاریخ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

یہ تاریخی داستان تیسری صدی عیسوی کے پس منظر میں پیش آنے والے واقعات کے گرد گھومتی ہے - اس داستان کا زمانہ 165 عیسوی سے 280 عیسوی تک کا ہے۔ جب ہان خاندان کی سلطنت زوال کا شکار ہو رہی تھی اور ہر طرف انتشار پھیلا ہوا تھا۔ خانہ جنگی کی وجہ سے مختلف قسمت آزما ملک کے مختلف علاقوں پر قبضے کے لیے کوشاں تھے۔ یہ داستان 57 ابواب پر مشتمل ہے اور چین کی وسیع سلطنت کے تین حصوں میں تقسیم ہونے تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان تین سلطنتوں کے نام وے سلطنت، ؤو سلطنت، اروشو سلطنت ہے۔

یہ داستان پیچیدہ روایتی اقدار، قدیم تاریخی قس منظر اور مہم جوئی کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے، اس میں چینی باشندوں کی زندگی سیاسی منظرنامے، جنگی حکمت عملی، وفاداریوں، بغاوتوں، تہذیبی اور سماجی روایات و رسومات، حصول اقدار کے لیے لڑی جانے والی جنگوں، فوجوں، لشکروں، حکومتوں اور سیاست کے ایوانوں کی عکاسی کی گئی ہے - درحقیقت یہ داستان 120 ابواب پر مشتمل ہے جب کہ مترجم نے 57 ابواب کا احاطہ کیا ہے۔

اس تاریخی داستان کے بیسویوں کردار ہیں۔ اہم کرداروں میں ''تھاؤ تھاؤ'' ''سن چھوان''، لیوبے''، ''شوان وے''، سردار گوان''، ''چنگ فے''، ''چنگ شیو''، چنگ شیو'' اور اس کا مشیر جیا شو وغیرہ شامل ہیں۔ یہ داستان تخیلاتی نہیں بلکہ چینی تاریخ کے اہم ادوار کا احاطہ کرتی ہے اور چینی ادب اور ثقافت، معاشرت، سماجی حالات و واقعات اور سیاسی منظرنامے کی سچی عکاس ہے۔

اس داستان کا مرکزی کردار تھاؤ تھاؤ ہے۔ تھاؤ تھاؤ جنگی حکمت عملی کا ماہر ہے۔ وہ سیاسی داؤ پیچ لڑانے میں طاق ہے۔ جنگی چالیں چلنے میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ دشمن پر ایسے حملہ آور ہونے کا خواہش مند دکھائی دیتا ہے جہاں دشمن کو اس کی امید بھی نہ ہو۔ وہ بڑے حملے سے قبل دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے پہلے چھوٹی چھوٹی جھڑپوں پر انحصار کرتا ہے اور انہی معلومات کی بنیاد پر زوردار حملے کے ذریعے فتح

حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے رازوں کی حفاظت کرتا ہے اور دشمن پر اپنی کمزوری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ وہ اصولوں کا پکا، انصاف پسند، باصلاحیت افراد کا قدرداان اور سادگی پسند شخص ہے۔ جب کہ ''لیوبے'' کا کردار نرم دل اور عوام دوست انسان کا ہے جب کہ ''گوان یو'' بہادری اور وفاداری کا عملی نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس داستان میں ''شن پھائے'' کا کردار بھی اہمیت رکھتا ہے جس نے تمام عمر ''یو این' خاندان کی خدمت گزار میں صرف کی اور موت سے قبل بھی اس نے خواہش کی کہ اس کا آقا شمال کی سمت گئے ہیں لہٰذا اس کا منہ شمال کی جانب کر کے ذبح کیا جائے۔ گویا کردار وفاداری اور وقار کی علامت ہے۔

اس داستان کا پلاٹ بہت پھیلاؤ رکھتا ہے۔ کردار بھی بہت زیادہ ہیں سوائے چند کرداروں کے زیادہ تر کردار کہانی کے بے جا پھیلاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ مؤلف نے اس کو ناول قرار دیا ہے جب کہ راقم الحروف کی نظر میں اس کو اگر ناول کے بجائے داستان کے زمرے میں رکھ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ناول کی طرح اس میں کہیں کہیں حقیقی زندگی کی جھلک تو دکھائی دیتی ہے مگر غیر ضروری طوالت نے اس محض کہانی کا روپ دے دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ اس داستان کے پس منظر میں چین کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ جب بھی کوئی قوم روبہ زوال ہوتی ہے تو اس میں خانہ جنگی کے حالات جنم لیتے ہیں۔ کشت، خون، محلاتی سازشیں، اقتدار پر قابض ہونے کی کوششیں اور جنگی عزائم اس داستان کا موضوع ہے۔ انھی کے پہلو بہ پہلو چینی ثقافت اور تاریخ کے کئی گوشے منظر عام پر آ جاتے ہیں۔ البتہ ابواب کے طویل عنوانات نہ صرف قاری کو کھلتے ہیں بل کہ عنوان دیکھ کر ہی کو اصل مفہوم بھانپ لیتے ہیں اور تجسس مفقود ہو جاتا ہے۔

ظہور احمد بلاشبہ داد و تحسین کے حقدار ہیں کہ انھوں نے چینی تاریخ کے پھیلے ہوئے ابواب کو سمیٹنے کی کامیابی سعی کی ہے اور اُردو زبان کے قارئین تک چینی تاریخ و ثقافت اور سیاسی منظر نامے کو بخوبی پہنچایا ہے۔ اس کامیاب کوشش پر مترجم و مؤلف ظہور احمد مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

شبیر نازش کی شاعری میں استعارات کا نظام۔۔۔ایک مختصر تعارف

شبیر نازش کی شاعری عصری اردو ادب کا ایک ایسا دفتر ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے غزل کے روایتی چہرے کو بگاڑے بغیر اسے انسانی مسائل، الجھنوں اور آرزوؤں کا ترجمان بنایا ہے۔ ان کے لہجے کا دھیما پن، سچائی، صوفیانہ لمس اور جرأت مندانہ فکری پرواز انہیں ہم عصر شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

شبیر نازش کے فکری کینوس کو سمجھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ ان کی شاعری میں زیرِ عمل استعارات و علامات کے نظام کو سمجھا جائے۔ وہ روایتی علامات اور استعارات کو استعمال کرتے ہیں مگر جوں کا توں نہیں، بل کہ ان کی جراحت کر کے ان میں نئے عصری معنی پھونک دیتے ہیں۔ ان کے شعری نظام میں چند استعارے اس قدر تکرار کے ساتھ آئے ہیں کہ وہ اب ان کی انفرادی پہچان بن چکے ہیں۔

نازش کلاسیکیت کے طے شدہ جمالیاتی معیارات جیسے میر کے دھیمے پن اور مصحفی کی سادگی سے انحراف نہیں کرتے، لیکن اس روایتی سانچے میں وہ اکیسویں صدی کے انسان کے فکری مسائل کو بڑی مہارت سے تراشتے ہیں۔ ان کے ہاں روایت صرف ایک وراثت نہیں بل کہ ایک زندہ تخلیقی اوزار ہے۔ وہ متقدمین کی لغت کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں سے جدید دور کی تنہائی اور بیگانگی برآمد ہوتی ہے۔

نازش کی شاعری میں ''آنکھ'' محض روایاتی انداز میں استعمال نہیں ہوئی، بل کہ یہ ان کے استعاراتی نظام کا سب سے طاقت ور مرکز ہے۔ ان کے دو مجموعوں کے نام ''آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ'' اور ''ہم تری آنکھ سے ہجرت نہیں کرنے والے'' اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

ہم تری ''آنکھ'' سے ہجرت نہیں کرنے والے

.....

اظفر رضا

یہاں ''آنکھ'' کو ایک پناہ گاہ اور وجود کے اثبات (Assertion of Existence) کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو کہ جدید شاعری کا ایک خوب صورت استعارہ ہے۔

اور آگے بڑھیں تو---

تُو ہی بتا کہ آنکھ کے شمشان گھاٹ میں
کیسے بسا لوں مَیں تجھے لاشیں نکال کر

.....

''آنکھ کا شمشان گھاٹ'' جیسی تراکیب نازش کا ہی خاصہ ہیں۔

مَیں ہوں کیا ، آئنہ پگھل جائے
تُو اگر آنکھ بھر کے دیکھے تو

.....

ہیں بظاہر جو مست مست نہیں
آنکھ رکھتے ہیں ہر ستارے پر

.....

چہرہ کوئی بھی آنکھ میں ٹھہرا نہ پھر کبھی
دل نے کسی بھی شخص کو چاہا نہ پھر کبھی

.....

آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ کہاں جاتے ہیں
عشق ہو جائے تو پھر روگ کہاں جاتے ہیں

.....

لوٹے تو یہ نہ سوچے کہ خط جھوٹ موٹ تھے
مَیں رکھ چلا ہوں بام پر آنکھیں نکال کر

.....

یہاں آنکھ کئی منفرد معنوں میں ہے، جیسے---

جائے پناہ--- وہ آنکھ کو ایک ایسی محفوظ بستی یا شہر قرار دیتے ہیں جہاں یادیں اور لوگ پناہ لیتے ہیں۔

بصیرت --- محبوب کی آنکھ کائنات کے حقائق کو دیکھنے کا ایک فلسفیانہ چشمہ ہے۔

شناخت کا مرکز--- آنکھ سے نکلنا یا ہجرت کرنا وجود کے مٹ جانے کے مترادف ہے۔

نازش کے استعاراتی نظام میں ''کارِ جہاں'' مادی دنیا کی ان مجبوریوں اور سفاکیوں کا استعارہ ہے جو انسان کو جذباتی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ نازش کی غزل وجودی تنہائی کا نوحہ ہے۔ صنعتی اور شہری زندگی نے رشتوں کی معنویت ختم کر دی۔ نازش اس المیے کو سستی جذباتیت کے بجائے ایک عمیق اداسی کے ساتھ تخلیق کرتے ہیں---

اُسے بھی کارِ جہاں سے نہ مل سکی فرصت
مجھے بھی ہو گئی تاخیر عجلتوں سے اُدھر

.....

اس طرح کے مضامین عصری معاشرے میں وقت کی کمی اور میکانکی زندگی کے باعث پیدا ہونے والے فاصلوں پر ایک گہرا عمرانی تبصرہ ہیں۔

اب آتے ہیں ''ہجرت'' کی جانب---

نازش کے یہاں ہجرت ایک شہر سے دوسرے شہر نقل مکانی نہیں، بل کہ وجودی

بے گھری اور باطنی شکست کا نوحہ ہے۔ یہ لفظ نازش کے اشعار میں جدید شہری زندگی کی بیگانگی کو بہت گہرائی سے بیان کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان مادی طور پر جتنا بھی مستحکم ہو، وہ اپنی ذات میں اندر سے کٹا ہوا اور مہاجر ہے۔ نازش رشتوں کے بدلتے، قدروں کے پامال ہونے اور اپنوں سے دور ہونے کی کیفیت کو ''ہجرت'' کے روپ میں مجسم کرتے ہیں۔

یہ ہجرتیں تو مقدر ہیں اور مشغلہ بھی
تُو بے گھری کے حوالے سے وسوسوں میں نہ ڈال

.....

نازش کے اشعار میں ہجرت کے ساتھ شناخت کا بحران ایک خاص انداز سے آتا ہے۔ ان کے ہاں ہجرت محض معاشرتی یا معاشی نہیں بل کہ ایک باطنی اور نفسیاتی تجربہ ہے۔ انسان جب اپنی جڑوں سے کٹ کر نئے ماحول میں آتا ہے، تو اسے اپنی شناخت بچانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ان کے اشعار اس داخلی کشمکش کا بیانیہ ہیں۔

پھر آنکھ سے ہجرت کر جانا تو بہت ہی منفرد مضمون ہے ---

کم ترے ضبط کی قیمت نہیں کرنے والے
ہم تری آنکھ سے ہجرت نہیں کرنے والے

.....

نازش ''قیام'' اور ''سفر'' کو بھی برتتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں سفر، راہ، قیام اور ٹھہراؤ متوازی استعارات کے طور پر چلتے ہیں۔ وہ سفر کو زندگی کی حرکت اور آزمائش سے تشبیہ دیتے ہیں۔

مَیں اِس جہان کو کچھ اَور دینا چاہتا ہوں
تُو کاروقت کے پرہول چکروں میں نہ ڈال

.....

جب کہ ''قیام'' بعض اوقات مصلحت، جمود یا پھر ایک بڑی تباہی سے بچنے کی تدبیر بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کا یہ شعر ضرب المثال میں جگہ پاتا ہے کہ جہاں وبائی خوف کو ''قیام'' کا استعارہ دیا گیا۔

گھوم پھر کے نہ قتلِ عام کرے
جو جہاں ہے وہیں قیام کرے

.....

شبیر نازش جدید اردو شاعری کے اس دھارے سے تعلق رکھتے ہیں جو نعرے بازی اور ابہام کے نام پر لفاظی کرنے کے سخت خلاف ہے۔ ان کی شاعری مابعد جدید دور کے انسان کے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنے اور اسے روایت کے تسلسل سے جوڑنے کی ایک کامیاب تخلیقی کوشش ہے۔

بلند بانگ نعرے بازی کے بجائے ان کا سماجی اور سیاسی شعور نہایت دھیمے لہجے مگر کاٹ دار انداز میں سامنے آتا ہے۔ جب وہ وبائی صورت حال یا سماجی ٹوٹ پھوٹ پر بات

کرتے ہیں، تو ان کا لہجہ ناصحانہ نہیں بل کہ مبنی برحقیقت ہوتا ہے۔

شاعر مبالغہ آرائی کے باعث ''خطرات'' سے دوچار رہتا ہے، لیکن نازش کے ہاں اعتدال شرط ہے۔ ان کی غزل کے اشعار صوفیانہ لہر میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ وہ علامات و استعارات کا انتخاب اتنی احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں کہ بحر کی روانی اور فکری بلندی یکجا ہو جاتی ہیں۔ نازش مختصر اور طویل بحروں پر یکساں گرفت رکھتے ہیں۔ طویل بحر میں عموماً غزل کا تسلسل ٹوٹنے کا ڈر ہوتا ہے، لیکن ان کے ہاں ردیف اور قافیے کی نشست و برخاست اتنی چست ہوتی ہے کہ روانی برقرار رہتی ہے۔ وہ ثقیل اور بوجھل الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور روزمرہ کی زبان کو شعری حسن عطا کر دیتے ہیں۔

تری جدائی کے صدمے نے کر دیا پاگل
رہا ملال نہ کوئی ، ترے ملال کے بعد

.....

مزاحمت ، کشمکش ، سیاسی اور سماجی جبر کے خلاف نازش کا استعاراتی نظام کربلائی جمالیات سے جڑا ہوا ہے۔

کربلا کے لیے مخصوص ہے بس ایک ہی شخص
دوسرا کوئی بھی شبیر نہیں ہو سکتا

.....

''نوک سناں'' ان کے یہاں حاکم وقت کے جبر، آمریت اور مصلحت پسند معاشرے کا استعارہ ہے، جبکہ ''سر'' ضمیر کی آواز اور سچائی پر سمجھوتہ نہ کرنے والی انفرادیت کا استعارہ ہے۔

کاٹ کر پھینک دے سر چاہے سجا نیزے پر
ہم ترے ہاتھ پہ بیعت نہیں کرنے والے

حاکم وقت ذرا اپنے گریبان میں جھانک
لوگ بے وجہ بغاوت نہیں کرنے والے

.....

یہ استعارے ان کے اسلوب کو ایک منفرد کاٹ اور جرأت عطا کرتے ہیں۔

بات یہ اُس کے گماں میں بھی کہاں ہوگی بھلا
ایک سر، یاں سے سرِ نوکِ سناں گزرے گا

.....

اسی طرح وہ ہجر کی کیفیت سے آغاز کرتے ہیں اور پھر اس اندرونی احساس کو ایک مستقل صوتی اور بصری استعارہ بنا کر ''لباسِ ہجر'' کا نام دیتے ہیں، گویا دکھ انسان کے وجود کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہو یا پھر حد یہ کہ ایک مجسم برہنہ شمشیر۔

ملول دیکھ کے تجھ کو مَیں رُک نہ جاؤں کہیں
خدارا ہجر کی شدت کو آنسوؤں میں نہ ڈال

.....

آ گلے مل کے ابھی ہجر کا ماتم کر لیں
کس کو معلوم کہاں میل دوبارہ ہوگا

چاہو تو کر لو شوق سے تم بھی حساب وصل
اِک پل بچے گا ہجر کی راتیں نکال کر

.....

اُس نے بطور تحفہ دیا تھا لباسِ ہجر
پہنا جو ایک بار اتارا نہ پھر کبھی

.....

اِک اختلافِ رائے پر اِس درجہ برہمی
کیوں دوست تُو نے ہجر کی شمشیر کھینچ لی

.....

نازش کی شاعری میں ''آئینہ'' بھی روایت کے ساتھ جدت رکھتا ہے۔

عکس مجھ کو دکھا رہا ہے کون
سامنے آئینہ تو ہے ہی نہیں

.....

ایک اور غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جسم و جاں دیکھ کر لرزتے ہیں
کوئی افتاد ہے کہ آئینہ

دلِ درویش کچھ بتا تُو ہی
عشق آباد ہے کہ آئینہ

کوئی بتلاؤ سامنے میرے
میرا ہم زاد ہے کہ آئینہ

.....

شبیر نازش کے استعاراتی نظام میں ''لباس'' اور ''خاموشی'' دو ایسے اچھوتے اور گہرے استعارے ہیں جو ان کے باطنی کرب اور فکری پختگی کو پوری طرح نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں لباس، باطن کا اوڑھنا بچھونا اور وجودی حقیقت ہے۔ کلاسیکی اردو شاعری میں لباس کبھی ''چاک گریبان'' تو کبھی ''امیرانہ ٹھاٹ'' اور کبھی ''درویشی'' کے ذیل میں آتا تھا۔ لیکن شبیر نازش نے لباس کے روایتی تصور کو یکسر بدل دیا ہے۔ ان کے ہاں لباس انسان کی مستقل کیفیت، یادوں کے تسلسل اور دکھ کے وجودی احاطے کا استعارہ ہے۔

تُو میری روح مرا عشق ہے بِدر ہو جا
شجر نہیں ہوں کہ بدلوں لباس سال کے بعد

.....

یہی تو دکھ کا مستقل اثاثہ ہے۔ دوسری جانب نازش کے ہاں جدائی یا ہجر کوئی عارضی احساس نہیں ہے جسے وقت مرہم رکھ کر مٹا دے۔ وہ اسے ایک ایسے ''لباس'' سے تشبیہ دیتے ہیں جو روح کا حصہ بن جاتا ہے، ذرا پھر ملاحظہ کیجیے:

اُس نے بطور تحفہ دیا تھا لباسِ ہجر
پہنا جو ایک بار اتارا نہ پھر کبھی

.....

اب ''لباس'' یہ واضح کر رہا ہے کہ صدمہ انسان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اب اسے الگ کرنا خود اپنے باطنی وجود کو عریاں کرنے کے مترادف ہے۔

وہ لباس کو انسان کے باطن کے تضاد کو

چھپانے والے ایک سماجی پردے کے طور پر بھی برتتے ہیں، جہاں دنیا صرف بیرونی رکھ رکھاؤ دیکھتی ہے اور اندر کے بکھرے ہوئے وجود سے بے خبر رہتی ہے۔ الغرض لباس دکھ کو باوقار طریقے سے وجود پر سجا لینے کا نام ہے۔

نازش ''خاموشی'' کو بھی عجیب انداز سے پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر خاموشی کو کمزوری، بے بسی یا ہار مان لینے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن نازش کی شعری کائنات میں ''خاموشی'' طاقت کا سب سے بڑا مظہر اور ایک کاٹ دار احتجاج بن کر ابھرتی ہے۔ ان کے ہاں خاموشی مصلحت نہیں، بل کہ ایک ایسا باطنی طوفان ہے جو پھٹنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ وہ مصلحت پسند اور شورش زدہ معاشرے میں سستی نعرے بازی کرنے کے بجائے خاموشی کو اپنا ہتھیار بناتے ہیں، جو ان کی جرات رندانہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا یہ کلاسک شعر دیکھیے:

ہم ہیں خاموش تو خاموش ہی رہنے دیجے
ہم جو بولے تو سماعت پہ گراں گزرے گا

.....

یہاں خاموشی حقیر نہیں، بل کہ ایک ایسی فکری سچائی کا استعارہ ہے جسے اگر الفاظ کا روپ دے دیا جائے تو معاشرے کے بت لرز اٹھیں گے۔ یہ خاموشی حاکمِ وقت کے سامنے ایک باوقار انکار ہے۔ جب رشتوں میں لفظ اپنی تاثیر کھو دیتے ہیں، تو وہاں خاموشی گفتگو کا پرچم سنبھال لیتی ہے۔ وہ خاموشی کو ایک ایسی زبان کے طور پر برتتے ہیں جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی اور دلوں کے درمیان براہِ راست رابطہ قائم کرتی ہے۔ خاموشی اس دکھ کو دنیا کے سامنے تماشہ نہ بننے دینے کا صوفیانہ سلیقہ ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ شبیر نازش کا فن اندرونی دنیا کی پاس داری کا فن ہے۔

.....

غور کیا جائے تو شبیر نازش کے استعارات و علامات میں ''چراغ'' اور ''دیوار'' دو ایسی کلیدی اور گہری اصطلاحات ہیں جو ان کے فکری تضادات، عصری جبر اور باطنی روشنی کو مجسم کرتی ہیں۔ کلاسیکی اردو شاعری میں یہ دونوں علامتیں بہت عام رہی ہیں، لیکن نازش نے انہیں جدید شہری اور نفسیاتی زندگی کے تناظر میں ایک بالکل نیا رخ دیا ہے۔ کلاسیکی شاعری میں چراغ عام طور پر ''محفل کی رونق'' یا ''رات کے اندھیرے میں روشنی'' کے لیے آتا تھا۔ لیکن شبیر نازش کے اس شعر میں چراغ، سورج اور چاند کا استعمال کسی اور طرح سے ہوا ہے، ان کی برجستگی ملاحظہ کیجیے۔

تم بات کر رہے ہو میاں اک چراغ کی
سورج بھی میرے چاند کے ہالے میں آ گیا

.....

باطنی سچائی کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا جاہ وجلال بھی ہیچ ہے۔ چراغ جلنا محض روشنی نہیں بل کہ تاریک قوتوں، ناانصافی اور مصلحت پسند معاشرے کے خلاف ایک خاموش جنگ ہے۔ چراغ ان کی غزل میں ایک ایسی کشمکش بنتا ہے جو مایوسی کے شدید ترین طوفان میں بھی اپنی لو کو جھکنے نہیں دیتی۔

دل اور طرح کا ہے دماغ اور طرح کا
اور بیچ میں جلتا ہے چراغ اور طرح

.....

اردو غزل میں دیوار کو عموماً ''قید'' یا ''وحشت میں سر ٹکرانے کی جگہ'' سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، شبیر نازش کے ہاں ''دیوار'' انسانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی نفسیاتی دوریوں، انسانی انا اور مادی سماج کی بے حسی کا ایک انتہائی طاقت ور استعارہ ہے۔ نازش نے جدید انسان کی سب سے بڑی مادی اور نفسیاتی الجھن کو ''دیوار انا'' کا نام دیا ہے۔ ان کا یہ منفرد شعر اس مابعد جدید المیے کی گہری عکاسی کرتا ہے۔۔۔

ایک انبوہِ تغیر پسِ دیوارِ انا
صورتِ حال بتاتی ہے میاں! گزرے گا

.....

اس شعر میں انھوں نے ''دیوارِ انا'' کے پیچھے چھپے ہوئے تبدیلیوں کے ایک بڑے طوفان کا تذکرہ کیا ہے۔ یعنی انسان اپنی جھوٹی انا کی دیواریں کھڑی کر کے خود کو محفوظ سمجھتا ہے، لیکن وقت کی تبدیلی اس دیوار کو گرا کر ہی دم لیتی ہے۔ وہ شہری زندگی کی اس سرد مہری کو بھی دیوار کے استعارے سے واضح کرتے ہیں جہاں ایک ہی چھت کے نیچے یا برابر برابر رہنے کے باوجود دلوں کے درمیان نادیدہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں، جو انسان کو ایک دوسرے سے دور کر دیتی ہیں۔ شبیر نازش کی شاعری میں ''دیوار'' اس مادی دنیا اور انسانی انا کا نام ہے جو راستوں کو روکتی ہے اور انسان کو تنہا کرتی ہے۔

شبیر نازش کا استعاراتی نظام گنجلک ہے نہ مبہم، بل کہ شفاف اور مربوط ہے - ان کے استعارے قاری کو الجھاتے نہیں بل کہ اس کے حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ بہت آسانی سے روزمرہ کی زندگی کی اشیاء اور کیفیات کو کائناتی سچائیوں کے استعارے میں تبدیل کر دیتے ہیں، جو ان کی شعری جادوگری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ باصلاحیت شاعر بلاشبہ اردو غزل کے مستقبل کو روشن اور مستحکم کرنے میں اپنا تاریخی کردار ادا کر رہا ہے۔ یوں ان کا کلام سنجیدہ قاری کو ہمیشہ ایک دلی سکون کا احساس دلاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر انور سجاد اور چھٹی کا دن

محمود احمد قاضی صاحب چونا منڈی میں ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر بیٹھے کہنے لگے آپ کا افسانہ ''چھٹی کا دن'' تنویر کو بہت پسند ہے۔ اکثر ذکر کرتا ہے۔ پوچھنے لگے ہاں تنویر قاضی کیا مسئلہ ہے آپ کا۔ میں نے کہا آپ کی ساری تحریریں پسند کرتا ہوں لیکن ایک بینکر کے ناطے چھٹی میرے لیے ایک نایاب چیز ہے۔۔ جس کا میں ایک ہفتہ انتظار کرتا ہوں۔

یہ قصہ کم وبیش چالیس برس پہلے کا ہے۔ اُن کا فکشن اتنا آسان نہ تھا لیکن وہ گفتگو اور میل ملاپ میں بہت سادہ اور آسان تھے۔۔ پہناوا بھی رعب جمانے والا نہ پہنتے تھے۔

کلینک والی ملاقات میں قاضی صاحب نے انہیں پوچھا کہ ایک جگہ پر آپ نے یہ حدیث حوالہ کی ہے۔؛؛جس کے موسم میں پرندے تک گھونسلوں میں مر جاتے ہیں'' میری نظر سے تو کبھی نہیں گزری آپ کو کہاں سے یہ حدیث ملی۔۔ کہنے لگے؛؛ لوگوں نے اتنی احادیث بنالی ہیں مجھ پر آپ کو اعتراض ہوگیا ہے؛؛ اس بات پر ہم ہنسنے لگے۔

ایک دوسری ملاقات میں ہم مریضوں کے بینچ پر بیٹھ گئے کچھ مریض بھگتنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ قاضی صاحب کی نبض پر آنے سے پہلے وہ ان سے بغلگیر ہو چکے تھے مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے کہ قاضی صاحب نے پوچھا کیا آپ نے داڑھی رکھ لی ہے۔۔ کہنے لگے ''نہیں کھسیا گاڑی سے آلگا تھا'' اُن کی ٹھوڑی پر پٹی بندھی تھی۔ ایسے میں ہم علیحدہ ایک جگہ بیٹھ کر مختلف موضوعات چھیڑنے لگے۔۔

میری یادداشت میں قاضی صاحب کی افسانوں کی پہلی کتاب ؛؛ہوا؛؛ کی تعارفی تقریب بھی ہے جو فری میسن ہال لاہور میں ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر انور سجاد نے کی یہ بات غالبن 1980 کی ہے۔ وہ بڑی نپی تلی باتوں کے قائل تھے لوگ جنھیں انہماک سے سنتے ،، فکشن رائٹر تو وہ تھے ہی منفرد، خوبصورت اور بلند پایہ لیکن دانشور بھی بے مثل تھے۔ آدرش میں ڈھلے،، ذات میں انجمن، مشفق اور نفیس انسان تھے۔۔ کلینک پر صفدر نامی آدمی انہیں اسسٹ کرتا تھا اسے غریب غُربا کے لیے خاص اشارہ کرتے جس کا مطلب دوائی بغیر ادائیگی تھا۔ ان کے رویئے سے لگا کہ ان کو پیسہ جمع کرنے کا شوق نہیں ،، درد دل رکھنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔

ہم ان کی وفات پر حبس زدہ موسم کے پرندوں سمیت بہت افسردہ ہیں۔ آج ''چھٹی کا دن'' بھی ہے۔۔

☆☆☆☆☆

تنویر قاضی

پریم نگری کی کتابوں میں بولتا سفیر، قمر اقبال صُوفی

ایک درویش ہر صدی میں رضا
جس کا عشاق زمانہ ہوتا ہے
مستحسن جامی

خاکسار نے شہرِ خُوباں چکوال میں سکول کالج لائف کے 6 سال آوارگی کے دوران محدودے چند صاحبانِ نظر و فکر، باشرع فُقرا کی قدم بوسی کی۔ روحانی شعور نہ تھا۔ صرف دیکھنے تک محدود رہا۔ اعلیٰ حضرت خواجہ عبدالکریم (1890-1981) کے ساتھ انوار آباد کی مسجد میں جمعہ کو صحن میں دریاں بچھانا اور باجماعت عصر کی نماز پڑھ لینا۔ یادگار مادر علمی گورنمنٹ کالج کے پروفیسر عبدالرشید بمبل (عربی) جو ہن دیکھنے اندرونِ دل رنگ برنگے سوالات کے جوابات دے کر ورطہ حیرت میں ڈال دیتے۔ خواجہ بشیر + سائیں محرم کی مجذوبانہ گفتگو کا سامع رہا۔

درونِ سروس سوائے مردِ دانا، روحانی اتالیق بابا پیر ولایت حسین شاہ ہاشمیؒ (1902-1967) کے سوا کسی صاحب بصارت و بصیرت سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ملازمت سے سبکدوشی 1998 میں بیروزگاری کے وقت کے وقت زہر پیتے ہوئے ایام پریشانی میں بابا اجمیریؒ جو انڈین تھے اور روحانی طور پر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے فیض یاب تھے۔ عالم خواب میں رسولِ مقبول کی زیارت کرانے کا اشارہ دیا۔ ان کی رہائش گاہ فیکٹری سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ وقت بھی تھا بدبختی سے انکے فقیر خانے تک نہ جا سکا۔ تین دن بعد اعلان ہوا کہ بابا اجمیریؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔ 6 بجے شام جنازہ کی ادائیگی ہو گی۔ سوائے پچھتاوے کے دوسرا لفظ نہیں ہے۔

لیہ شوگر ملز سے مستقلاً مراجعت کے بعد آبائی قصبہ میں بیروزگاری کا 3 سالہ چلہ خاصا مشکل اور چیلنج تھا۔ صاحب کشف حاجی منیر، تترال کہون، جو روحانی فیض کے حصول کے لیے سخی سلطان العارفین حضرت باہوؒ اور اعلیٰ حضرت خواجہ عبدالکریم عید گاہ شریف، راولپنڈی کے یہاں ہفت روزہ دورہ پر جاتے واپسی پر ذرولایت دستک دیتے۔ خانقاہ عالیہ

آفتاب احمد ملک

خیر پوری پر کئی گھنٹے قیام کرتے اور روحانی موضوعات پر اپنے مُشاہدات و تجربات کی روشنی میں تفصیلاً گفتگو رہتی۔ معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ روحانیت کے موضوع پر تعدد کُتب کی ورق گردانی کی۔ یہ دنیا الگ اہمیت کی حامل ہے۔ دونوں دنیاوی آنکھیں بند اور تیری اندرونی آنکھ ہمہ وقت بیدار رہتی ہے۔ بابا نعمت اللہ شاہ ولیؒ (کچی پیش گوئیاں 900 برس قبل) کی معلوماتی کتاب کو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ عبدالعزیز بیرسٹر (بڑھیال نزد سہگل آباد) جو ڈائری تحریر کراتے۔ آئندہ 24 گھنٹوں میں رُونما ہونے والے واقعات کا ذکر ہوتا۔ راقم کے مُرشد کاملؒ نے 35 سال بعد کے حالات و واقعات نوٹ کرائے مثلاً موٹر وے تعمیر ہو گا۔ میانی میں فوج ہو گی۔ یعنی 2005 فوجی چھاؤنی تعمیر ہوئی۔ کتابیں روشنی دیتی ہیں۔ تنہائی کی ساتھی اور زندہ رہنے کی تحریک دیتی ہیں۔ کتابیں بولتی ہیں۔ لفظ کے پردے میں ایک دنیا بساتی ہیں۔

بعض کتابیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ معلوماتی خزانوں کے مجموعے لفظ و معنی کا نیا جہان آباد۔ معروف ادیبہ و مُصنفہ پروفیسر ڈاکٹر نجیہ عارف صاحبہ کی کتاب ''راگنی کی کھوج میں'' (مطبوعہ 2020) جو 280 صفحات پر مشتمل ہے۔ مطالعہ و تبصرہ کے لیے ملی۔ گو جلدی میں کاپی جوڑتے وقت صفحہ نمبر 17 تا 32 غائب ہیں۔ یہ موصوفہ کی کتاب دو زندگیاں گودے اور خول کی طرح آپس میں پیوست ہیں۔ ایک نجیہ کی آپ بیتی، دوسرے اُن کے مُرشد محمد عبیداللہ درائی (1907-1990) کی زندگی کے حالات جو وقتاً فوقتاً ان کے سننے میں آئے۔ نجیہ کی کبھی محمد عبداللہ درائیؒ سے ملاقات نہیں ہو سکی؟ جب ان کی عظمت سے آگاہی ہوئی تو وہ وصال فرما چکے تھے۔ لیکن نجیہ کی آپ بیتی میں جن واقعات اور محسوسات کا ذکر ہے۔ اس سے سراغ ملتا ہے کہ آخر الامران کا درائی صاحبؒ سے اویسی انداز میں منسلک ہونا مقدر تھا۔ سو انھوں نجیہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ گو ظاہراً نجیہ نے گورنمنٹ کالج جہلم کے پروفیسر باغ حسین کمالؒ (1937-2000) سے بیعت کی۔ معروف شاعر و بزرگ صاحب کمالو جمال سلسلہ اولیہ سے تعلق اور پنوال قصبہ کے باسی ہیں۔ چکوال خطہ دل رہا ہے۔ میری تحریروں کا مرکزیہ بختاور ضلع کی خوب صورت سرزمین ہے۔ فقیر زمین زادہ کا تعلق 1600 کے قدیمی قصبہ خیر پور سے ہے۔ گرد و پیش کے کرداروں پر لکھنے کا عمل 1972 سے تادم تحریر جاری ہے۔ رُوٹھ جانے اور لمحہ موجود میں بقیدِ حیات یارانِ تیز گام کی یادیں میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ ضلع چکوال ذی شان اپنی قدامت، تہذیب و ثقافت، علم و ادب، روحانی اقدار کے فروغ کے سلسلے میں تحقیق و تنقید، فکشن و شاعری میں ایسے نامور پیدا کیے کہ ان کی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ علم و دانش کے چراغ روشن کر کے اس دھرتی کے ذرے ذرے کو تاباں کر دیا۔ آج ڈیجی لائبریری میں سرزمین چکوال کا جامع علوم، پریم نگری کا

کتابوں میں بولتا سفیر قمر اقبال صوفی ہیں۔ عبقری شخصیت، نادرالکلام، دھیمہ لہجہ، خوب صورت و معنی خیز مدلل گفتگو، کبھی قاسم علی شاہ کے چینل پر روحانیت کے موضوع پر لیکچر دیتے نظر آتے(18-06-2025) تو کبھی روزنامہ 'سرزمین' لاہور کے کالم نگار منشا قاضی کی قلم کی نوک پر" دجلہ قطرہ میں، قطرہ دجلہ میں، چکوال کا دانش ور زندہ صُوفی قمر اقبال (24 ستمبر 2024) سخن ورانِ چکوال (2017 صفحہ نمبر 76 کے مطابق تاریخ پیدائش 30 جنوری 1975 ہے تو موصوف اس وقت عُمرِ رواں کے 69ویں خوب صورت کیلنڈر کو بڑے غور اور حیرانی سے دیکھ رہے ہیں۔

چند احباب کی مخصوص محفل میں اور مختلف چینلز و اخبارات میں اور سالانہ منعقدہ بابا شاہ مراد صوفی کانفرنس چکوال پریس کلب میں بارہا ملاقاتیں رہی ہیں۔ فقیر سرراہ کے علاوہ ہم عمر و ہم خیال اہلِ قلم موصوف کی روحانی علمی استعداد و نستعلیق شخصیت پر کالمز و مضامین تحریر کر چکے ملاقاتیں رہی ہیں۔ من کی گہری جھیل کا تیراک، ہم جیسے کم علم تشنگانِ شعر و ادب کی توجہ کا مرکزی کردار ہیں۔ بل کہ کتابوں کے زندہ قبرستان میں شہر ہنر میں شب و روز دُکھی انسانیت کے خدمت پر مامور ہیں۔ عسکری خاندان کے چشم و چراغ نے کاروبار کے سلسلے میں ایک عرصہ ہالینڈ میں گزارا۔ عمرِ عزیز مشاہدات و تجربات سے عبارت ہے۔ موصوف سے طبعاً 1991 میں ایک نئے سفر یعنی روحانیت کے مسافر کے طور پر زندہ رہنے کا عزم کیا اور تا حال اسی پر تاقب قدم ہیں۔

گو اس روحانی سفر کی طوالانی داستان ہے لیکن دلچسپ بھی ہے۔ جو مطبوعہ کُتب میں تحریر ہے۔ ایک درجن کتابوں کے متحرک زُود نویس مُصنف بھی ہیں۔ موصوف کی اولین کتاب "روحانیت، دانش اور حقیقتیں" (فروری 2021) جو 660 صفحات پر مشتمل ہے۔ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خوش بخت عامل و کامل اقبال صُوفی رقمطراز ہیں کہ "مجھے یہ باتیں معلوم نہ تھیں۔ کیونکہ میں بغیر پیر کے سالک تھا۔" (صفحہ نمبر 526) یہ کتاب خاصی دلچسپ اور راقم پہلی بار کسی کتاب کا دلدادہ بنا۔ صاحب موصوف قمر اقبال صوفی لفظوں کے شناور، خیر اور خُوشبو بکھیرنے والے مردم شناس شخصیت خوابوں خیالوں کے نگر کے مسافر نہیں، بل کہ عملی روحانی جدوجہد کا درس دینے اعلے فاضل مبلغ ہیں۔

روحانی مزاج کی حامل شخصیت کی روح کا تار تار میں جب اللہ اللہ ھُو کا ردھم بجتا ہے تو پس منظر میں استارے والا جوگی دھند لے دھندلے امکانات کو لیے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو کلی طور پر خُدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ جب صوفی بیدار ہوتا ہے۔ تو خالق کائنات ارضی و سماوی کی جانب رجوع کرتا ہے۔

میں حرف حرف سجالوں صحیفہ دل پہ
تُو برگ برگ سر شاخ آرزو بولے

خموش کیوں ہے یہ مسکن قلندروں کا رشید
کوئی تو وجد میں آئے کوئی تو ھُو بولے

☆☆☆☆☆

درویش لمحے کا درویش

(کامران ناشط کے شعری نظام کا ایک فکری و اسلوبیاتی مطالعہ)

تصوف محض خانقاہوں کی گوشہ نشینی، تسبیح کے دانوں کی بے سمت گردش یا دنیا سے فرار کا نام نہیں، بل کہ یہ اپنے وجود کی مسلسل شکست و ریخت سے گزر کر ایک سچے اور کھرے انسان کی تخلیق کا عمل ہے۔ جب یہ صوفیانہ رویہ اور دریشانہ فکر تخلیق کے سانچے میں ڈھلتی ہے، تو شاعر کو ایک نئی جہت اور لافانی مابعد الطبیعاتی لمس عطا کرتی ہے۔ کامران ناشط کا شعری مجموعہ ''درویش لمحے'' عصری حسیت اور داخلی مابعد الطبیعات کا ایک ایسا ہی خوب صورت سنگھ ہے، جہاں شعر کا خمیر مٹی کی سچائی اور روح کی بے قراری سے اٹھا ہے۔

اس مجموعے کا ''درویش'' کوئی روایتی، دنیا سے بیزار یا گوشہ نشین صوفی نہیں ہے، بل کہ وہ اسی دنیا کے ہنگاموں میں سانس لیتا، کارِ مسلسل کا حصہ بنتا اور مادی دنیا کے تھپیڑے کھا کر اپنی ذات کے جوہر کو تراشنے والا ایک باخبر تخلیق کار ہے۔ وہ ''لمحے'' کی قید میں ہو کر بھی زمان و مکان سے ماورا ہونے کی تڑپ رکھتا ہے۔

درویشی کا پہلا زینہ اپنی انا (Ego) کو مٹانا اور مسلسل خود احتسابی کے عمل سے گزرنا ہے۔ درویش لمحے کا درویش زمانے کی تلخیوں اور حادثات کی دھیمی آنچ میں تپ کر ٹوٹتا ضرور ہے، مگر وہ اس ٹوٹ پھوٹ پر نوحہ کناں ہونے کے بجائے اسے اپنی بقا اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے جب تک پرانا سانچہ نہیں ٹوٹے گا، مٹی کو نیا روپ نہیں مل سکتا۔ کاب کا ایک کلیدی شعر اس فکری صوفیانہ رویے کی لاجواب عکاسی کرتا ہے:

اسی کارِ مسلسل میں یہ روز و شب گزرتے ہیں
وہ مجھ کو توڑ دیتا ہے میں خود کو پھر بناتا ہوں

.....

اس شعر میں خالقِ حقیقی کے سامنے خود کو پیش کر دینے کا وہ نادر ہنر موجود ہے

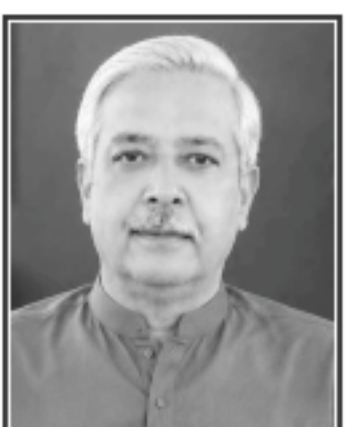

نعمان منظور

جہاں انسان اپنی مرضی کو مشیتِ ایزدی کے تابع کر دیتا ہے۔ یہاں صانع اور مٹی کا رشتہ واضح ہے۔ جہاں ہر شکست، ایک نئی خوبصورت ترتیب کو جنم دیتی ہے۔ یہ درویش گریہ و ماتم کا قائل نہیں، بل کہ اس کا دل بظاہر ہاری ہوئی بازیوں میں بھی اندرونی فتح کا جشن مناتا ہے:

اُسے معلوم ہوتا تو صفِ ماتم بچھی ہوتی
ہمارا دل ہماری ہار سے واقف نہیں اب تک

.....

یہاں ''ہار سے ناواقفیت'' دراصل اس باطنی فتح کی علامت ہے جو مادی دنیا کی جیت ہار سے بہت بلند ہے۔ دنیا جسے شکست سمجھ کر جشن مناتی ہے، درویش کا دل اسے ایک نئی اڑان کا پیش خیمہ قرار دیتا ہے۔

کامران ناشط کی شاعری کا ایک بڑا وصف ان کا ''فقرِ غیور'' ہے۔ اس مجموعے کا درویش بازارِ مصطفیٰ یا کوچۂ جاہ و جلال میں سر جھکانے والا کمزور انسان نہیں ہے۔ اس کے ہاں ایک ایسی انا اور عزتِ نفس ہے جو مادی فائدوں کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ کامران ناشط کے اشعار بظاہر ایک سادہ شکوہ محسوس ہوتے ہیں مگر اپنے اندر انسانی نفسیات، سماجی رویّوں اور باطن کی ٹوٹ پھوٹ کا ایک گہرا کرب سموئے ہوئے ہیں۔ شاعر نے نہایت سادہ لفظیات میں ایک ایسے المیے کو بیان کیا ہے جو ہمارے عہد کے ہر حساس انسان کا المیہ بن چکا ہے۔ یہی بڑی شاعری کی علامت ہے کہ وہ کم لفظوں میں زندگی کے وسیع تجربے کو سمیٹ لے۔

اسی کارِ مسلسل میں یہ روز و شب گزرتے ہیں
وہ مجھ کو توڑ دیتا ہے میں خود کو پھر بناتا ہوں

.....

پہلے شعر میں زندگی کو ''کارِ مسلسل'' کہا گیا ہے۔ یہ ترکیب محض روزگار یا معمولاتِ زندگی تک محدود نہیں بل کہ انسان کے اُس دائمی داخلی سفر کی علامت ہے جس میں وہ ہر روز بکھرتا اور سنورتا رہتا ہے۔ ''وہ'' ایک بہت وسیع استعارہ ہے۔ یہ ''وہ'' کوئی محبوب بھی ہو سکتا ہے، سماج بھی، وقت بھی، حالات بھی اور خود انسان کا نصیب بھی۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک قوت اُسے مسلسل توڑتی رہتی ہے مگر وہ ہار نہیں مانتا، خود کو پھر سے تعمیر کرتا ہے۔

یہاں ''توڑنے'' اور ''بنانے'' کی ضدی کیفیت انسانی وجود کی اصل داستان بن جاتی ہے۔ حساس انسان کبھی مکمل طور پر شکست قبول نہیں کرتا۔ وہ اندر سے زخمی ہو کر بھی اپنی ذات کے ٹکڑے سمیٹتا ہے اور پھر جینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جدوجہد انسان

کو زندہ رکھتی ہے۔ اس شعر میں شکست کے ساتھ ایک خاموش مزاحمت بھی موجود ہے۔ شعر کا حسن یہ بھی ہے کہ اس میں جذباتی شور نہیں بل کہ ایک تھکا ہوا وقار ہے۔ شاعر چیختا نہیں، آہستہ سے اپنی اذیت بیان کرتا ہے۔ یہی دھیمے لہجے کی اداسی قاری کے دل میں زیادہ گہرائی سے اترتی ہے:

اُسے معلوم ہوتا تو صفِ ماتم بچھی ہوتی
ہمارا دل ہماری ہار سے واقف نہیں اب تک

.....

دوسرا شعر پہلے شعر کی داخلی توسیع محسوس ہوتا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے دل کو ایک الگ وجود کے طور پیش کیا ہے۔ ''صفِ ماتم'' کی ترکیب شکست کے انتہائی کرب کو ظاہر کرتی ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر دل کو حقیقتِ حال کا مکمل ادراک ہو جاتا تو وہ غم سے بھر جاتا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ دل اب تک اپنی ہار سے پوری طرح واقف نہیں۔

یہ شعر انسانی امید کی آخری رمق کا استعارہ ہے۔ انسان مکمل شکست کے بعد بھی اندر کہیں نہ کہیں امید کا ایک چراغ روشن رکھتا ہے۔ دل اکثر حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ تسلیم کر لینا شاید مکمل فنا کے مترادف ہو۔ اسی لیے انسان ٹوٹ کر بھی زندہ رہتا ہے۔

کامران ناشط کے ان اشعار میں جدید انسان کی روحانی تھکن بھی موجود ہے اور اس کی خاموش استقامت بھی۔ شاعر نے فلسفہ نہیں باندھا بل کہ زندگی کی ایک سچی کیفیت کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ یہی سچائی شعر کو اثر انگیز بناتی ہے۔

''درویش لمحے'' جیسا عنوان بھی انہی اشعار کی فضا سے ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے۔ درویش لمحے وہی ہوتے ہیں جو انسان کو اندر سے بدل دیتے ہیں، اسے دنیا کی ظاہری چمک دمک سے ہٹا کر اپنے باطن کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی ایک ایسا شخص بولتا محسوس ہوتا ہے جو دکھ سے گزر کر کسی داخلی آگہی تک پہنچا ہے۔

کامران ناشط کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پیچیدہ لفظیات یا مصنوعی علامتوں کے بغیر قاری کے دل تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کے یہاں احساس کی سچائی، لہجے کی نرمی اور داخلی کرب کی تہذیب موجود ہے۔ یہی عناصر ان اشعار کو وقار بناتے ہیں۔

یہ اشعار انسانی نفسیات، رشتوں کی نزاکت، حالاتِ زندگی خودداری اور جدوجہد جیسے گہرے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، جنھیں شاعر نے نہایت خوبصورتی سے لفظوں کا روپ دیا ہے۔

ادب اور شاعری ہمیشہ سے انسانی معاشرے کا آئینہ

رہے ہیں۔ ایک حساس شاعر ان مصلحتوں، درد اور جذباتی کشمکش کو محسوس کر لیتا ہے، جن سے عام انسان روزمرہ زندگی میں گزرتا ہے۔ اگر ہم ان اشعار کے فکری پہلوؤں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خاندانی نظام اور بزرگوں کی اہمیت کو بہت گہرے انداز میں پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ایک شعر موجود ہے:

''سات نسلوں سے ہارے گھر کے پائین باغ میں
دفن کر وہ قیمتی سکے بھلا کس کام کے''

.....

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر باپ دادا کا چھوڑا ہوا سرمایہ یا خاندانی وقار موجودہ نسل کے کام نہ آئے، تو اس کی کوئی مادی یا معنوی قیمت نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح ایک اور جگہ باپ اور بیٹوں کے مکالمے کے ذریعے خاندانی وحدت کو واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

''باپ نے گھر چھوڑتے بیٹوں سے بس اتنا کہا
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے بھلا کس کام کے''

.....

یہ ایک باپ کی اپنے بیٹوں کو نصیحت ہے کہ گھر اور خاندان سے الگ ہو کر انسان کی کوئی اوقات نہیں رہتی۔ جس طرح درخت سے ٹوٹا ہوا پتا سوکھ کر پامال ہو جاتا ہے، اسی طرح خاندان سے کٹ جانے والا شخص معاشرے کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔

خاندانی تعلقات کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں محبت کی اس کیفیت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جہاں محبوب کی موجودگی اور اس کا روٹھنا ہی زندگی کا محور بن جاتا ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

''یوں اُس کی ذات میں رہیں دلچسپیاں مجھے
روٹھا وہ بار بار، منانے کے بعد بھی''

.....

انسان لاکھ کوشش کر لے، اگر دل کا سکون یا محبوب میسر نہ ہو تو ظاہر سجاوٹیں اور رونقیں بے معنی محسوس ہوتی ہیں، کیونکہ گھر کی اصل رونق اینٹ پتھروں یا آرائش سے نہیں، بل کہ اپنوں کی موجودگی سے ہوتی ہے، جس کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے:

''تو آ گیا تو سج گئیں ساری سجاوٹیں
گھر سج نہیں رہا تھا، سجانے کے بعد بھی''

.....

دوسری طرف، یہ شاعری انسان کو صرف جذباتی دنیا میں نہیں رکھتی بل کہ روزمرہ کی جدوجہد اور تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کراتی ہے۔ یہ ہر عام انسان کی کہانی ہے کہ وہ صبح گھر سے کسی اور ارادے اور منصوبہ بندی کے ساتھ نکلتا ہے، مگر زندگی کے حادثات اور ترجیحات اسے کسی اور ڈگر پر ڈال دیتی ہے:

''گھر سے ہر روز چلوں اور ارادے کر کے
زندگی اور ہی کاموں میں لگا دیتی ہے''

.....

اس سب کے باوجود، شاعر کا عزم اور حوصلہ مدہم نہیں ہوتا۔ وہ حالات کی سختی یا ظلم کے سامنے ہار ماننے کے بجائے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اے ہوا تیرا تعاقب کر رہا ہوں اس لیے
پھر ترے روندے چراغوں کو جلانا ہے کہیں''

یعنی جہاں جہاں وقت کی تیز ہوا امیدوں کے چراغ بجھائے گی، وہاں دوبارہ حوصلے کی شمعیں روشن کی جائیں گی۔

زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے شاعر دور اندیشی اور اعلیٰ ظرفی کا درس بھی دیتا ہے۔ اگلی نسلوں کو نفرتوں کی آگ سے بچانے اور ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے بعض اوقات دشمنوں سے بھی ہاتھ ملانا پڑتا ہے اور تنازعات کو دفن کرنا پڑتا ہے:

''خود پہ واجب کر لیتا تھا دشمنوں کا احترام
پچھلے جھگڑے بھولنے تھے اگلی نسلوں کے لیے''

.....

یہی وجہ ہے کہ جب انسان گلے شکوے چھوڑ کر مایوسی کا خاتمہ کرتا ہے اور تقدیر پر رونے کے بجائے اپنی محبت اور حکمتِ عملی پر بھروسہ کرتا ہے، تو بند راستے بھی خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ جیسا اس میں واضح نظر آ رہا ہے:

''اب کوئی شکوہ نہیں کاتبِ تقدیر سے
راستے کھلنے لگے ناخنِ تدبیر سے''

.....

ان تمام پہلوؤں کے ساتھ، یہاں معاشرتی بے حسی اور ایک سفید پوش انسان کی اندرونی کشمکش کو بھی آشکار کیا گیا ہے:

''میں پیشہ ور بھکاری ہوں میں گھر کو آ بھی جاؤں تو
کسی بازار میں اپنی ہتھیلی چھوڑ آتا ہوں''

.....

یہ شعر علامتی طور پر ظاہر کرتا ہے کہ ایک ایسا انسان جو اپنے روزگار کی خاطر کی دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا اپنی انا کا سودا کرنے پر مجبور ہے، وہ جسمانی طور پر تو شام کو گھر لوٹ آتا ہے، مگر اس کی خودداری اور روح اسی بازار کی بے حسی میں گروی رہ جاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ یہ تمام اشعار ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ زندگی صرف خوشیوں کا نام نہیں، بل کہ یہ رشتوں کو نبھانے، حالات سے لڑنے، نئی نسل کے لیے قربانی دینے اور ہر حال میں اپنی خودداری کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ شاعر نے نہایت سادہ مگر اثر انگیز الفاظ میں انسانی زندگی کے پورے فلسفے کو ان ابیات میں سمو دیا ہے۔

☆☆☆☆

سانجھ

وہ مری محبت کی سیڑھیوں تک آتی تھی
اس کو میرے آنگن کی خامشی نہ بھاتی تھی
روپ دھار لیتی تھی ، راستے میں دریا کا
خار و خس بھی ساتھ اپنے وہ بہا کے لاتی تھی
خود کو بھول جاتی تھی ، مجھ کو روبرو پا کر
وہ حقیقتوں کو بھی خواب کر دکھاتی تھی
تن سمیٹ لیتی تھی ، کتنی رازداری سے
روح تک پسینے میں بھیگ بھیگ جاتی تھی

o

کیا وہ پڑھ کے آتی تھی، جانے کن کتابوں سے
اک نیا سبق مجھ کو روز وہ پڑھاتی تھی
تن کی پہلی آہٹ پر، پھن وہ کاڑھ لیتی تھی
وہ مجھے بھی خود مجھ سے دور چھوڑ آتی تھی
دوسرے کنارے سے دیکھتا تھا میں خود کو
اور وہ ادھر اپنے بل میں رینگ جاتی تھی
یاد تھے اسے خالد ، نام غم نصیبوں کے
اک نہ اک کہانی وہ یاد کر کے آتی تھی

o

پور پور پر اپنے رنگ چھوڑ آتی تھی
انگ انگ وہ مجھ کو دنگ چھوڑ جاتی تھی
رنگ چھپاتے تھے ، دھیمے دھیمے لہجے میں
صبح تک مرے تن میں روح گنگناتی تھی
مجھ کو آن لیتی تھی ، رات کی خموشی میں
صبح تک وہ چنگاری مجھ کو چاٹ جاتی تھی
سطح خود پسندی سے ، عشق کی بلندی تک
کتنی درد مندی سے مجھ کو کھینچ لاتی تھی
اس کے ہوتے میں خود کو دیکھ بھی نہ پاتا تھا
وہ تو میری آنکھوں سے خود مجھے چھپاتی تھی
سرمئی اندھیروں کے آخری کنارے تک
ایک سنسنی رگ رگ پھیل پھیل جاتی تھی
اس کے تن کا پیراہن ، اس کے تن پہ سجتا تھا
وہ مری قبا تھی ، سو ، مجھ پہ راست آتی تھی
جھیل کی طرح میں بھی ، باہیں کھول دیتا تھا
وہ بھی موند کر آنکھیں ، مجھ میں ڈوب جاتی تھی

o

چٹکیوں میں وہ مجھ کو اس طرح اڑاتی تھی
میرے حصے میں میری خاک تک نہ آتی تھی
میری شاعری اس کی زندگی کا ایندھن تھا
وہ تو مجھ سے بھی میری مفلسی چھپاتی تھی
میری شاعری اس کا اوڑھنا بچھونا تھا
پیسہ پیسہ کر کے وہ شاعری بچاتی تھی
مست فن کسی شے کے، دام پوچھتا کس سے
سانپ سونگھ جاتا تھا، سانس تک نہ آتی تھی
اس طرح دباتی تھی ہونٹ اپنے دانتوں میں
بات سامنے کی بھی، لب تک آ نہ پاتی تھی
گرمیوں کے موسم کی زرد رو دوپہروں میں
خواب خواب شاخوں پر گھونسلے بناتی تھی
مجھ کو ڈھانپ لیتی تھی بے لباس موسم میں
برف کی ردا، میرے تن پہ ڈال جاتی تھی

O

میرے دل کو چھوتی تھی، خوں میں سرسراتی تھی
وہ کہ میری پوروں کو بولنا سکھاتی تھی
رات بھر کھٹکتی تھی، جلتی بجھتی آنکھوں میں
مجھ تک اڑ کے آتی تھی، اڑ کے جا نہ پاتی تھی
سطر سطر پڑھتی تھی، رات رات بھر مجھ کو
رات یاد رکھتی تھی، بات بھول جاتی تھی
عمر اس نے اس دن کی سیر میں گزاری تھی
اب بھی اس اندھیرے میں ٹھوکریں وہ کھاتی تھی
اب وہ سوئی رہتی ہے بادلوں کے ٹکڑوں میں
وہ کہ میرے پہلو میں کوند کوند جاتی تھی
صید زندگی کیا کیا سر نہیں کھپاتا تھا
راہ بچ نکلنے کی سامنے نہ آتی تھی
وہ مری محبت تھی، آس تھی، حیاتی تھی
روز جوڑ لیتا تھا، روز ٹوٹ جاتی تھی

خالد احمد

تحقیقی پٹاخے

''بھلا کیسے ترقی کی چڑھو سیڑھی
غلط تاریخ پڑھوائی گئی تم کو
محمد ابنِ قاسم،
سندھ کا فاتح سہی
لیکن نہ تھا سترہ برس کا
یہ تو گہری کھوج نے کھولا
کہ تب پچیسویں میں تھا
مسلمانوں نے کیا کیا جھوٹ پھیلائے
ارے توبہ!''

''لکھا اقبال نے شکوہ
لگائے فتوے مولاناؤں نے
تو خوف سے ان کے
جواب شکوہ لے آیا
کلام اس کا تضادوں سے بھرا پایا
کہ اس کی سوچ پر اوروں کا ہے سایا
یہ کیسے احمقوں نے
فلسفی اس کو ہے ٹھہرایا''

''تمہارا قائدِ اعظم تو
پاکستان کے حق میں نہیں تھا
اس کو تو انگریز نے
یہ ملک لینے میں وکیل اپنا بنایا تھا
ابھی تفتیش باقی ہے
کہ کتنا مال
خاص اِس کیس میں اُس نے کمایا تھا''

''نہیں! پوری یہ سچائی نہیں!
ممکن ہے
انگریزوں کا بھی کچھ ہاتھ ہو اِس میں
مگر تاریخ کہتی ہے
کہ یہ تو
کانگریس کی گہری سازش کا نتیجہ تھا
اُسے تقسیم کرنا تھا
مسلمانوں کی وحدت کو
یہی اس کی پریشانی تھی

جلیل عالی

ہر صورت فشارِ زورِ اُمت سے

خلاصی اُس کو پانی تھی"

نہیں پروا کوئی

اِس ڈھب کے تحقیقی پٹاخوں کی

ترس لیکن

خود اپنے ایسے اُتھلے،

کھوکھلے لوگوں پہ آتا ہے

جنہیں آپس میں ٹکراتے

لرزتے لڑکھڑاتے

دو قدم بھی

اپنے پاؤں پر نہ چل پاتے

یہ سب شوشے لبھاتے ہیں

جو ہیں نفسی مریض ایسے

ہنسی اپنی اڑانے میں خوشی پاتے ہیں

اپنی ذلتوں پر مسکراتے ہیں

غازیان وشہدائے کربلا کے نام

مظلوموں کا ساتھ نبھانا سُنّت ہے
غمِ حسینؓ میں رونا عین عبادت ہے

طائف سے کربل تک ایک کہانی ہے
نبیؐ سے آلِ نبیؐ تک ایک روایت ہے

یادِ حسینؓ کسی مسلک کا ورثہ نہیں
یہ مشترکہ غم ہے ، ورثۂ اُمّت ہے

ہم سب اپنی اَنا کی قید میں ہیں ، ورنہ
کربل ایک بلاتردید حقیقت ہے

کیا تم اُن اوراق کو پڑھ لو گے ، جن میں
معصوموں کے لہو سے رقم عبارت ہے

شامِ غریباں ہر اک سے یہ پوچھتی ہے
نبیؐ اور آلِ نبیؐ سے کسے محبت ہے

سنو یزیدو! کربل کی آواز سُنو
دِلوں پہ جو کی جائے ، وہی حکومت ہے

زینبؓ کے تاریخی خطبہ میں پنہاں
زہرہؓ کی حق گوئی ، علیؓ کی جرأت ہے

اِدھر حسینؓ ہے ، اُدھر یزید ہے جانِ انیس!
جو بھی آپ کا فیصلہ ، کُھلی عدالت ہے

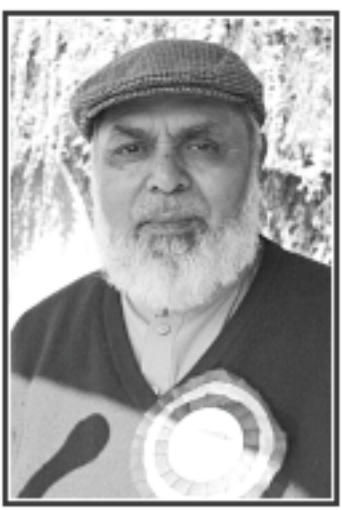

محمد انیس انصاری

ٹھوکر لگا دے گا

ترے سونے پہ تہمت کھوٹ کی زرگر لگا دے گا
ٹھکانے اس طرح شاطر ترا زیور لگا دے گا

تجھے سچائی پر ہو گی توقع داد پانے کی
ترے ہونٹوں سے کوئی زہر کا ساغر لگا دے گا

ذرا سا تم جہاں دیوار میں روزن بناؤ گے
وہاں زنداں کا داروغہ نیا پتھر لگا دے گا

ولی عہدی کی خواہش خوف سے خالی نہیں ہوتی
ترے پیچھے تری جاں کا عدو خنجر لگا دے گا

بلا قیمت نہیں ملتی کوئی بھی چیز دنیا میں
تجھے کیوں مفت میں آخر جہاں افسر لگا دے گا

تمناؤں کی خاطر بازیاں لگتی ہی رہتی ہیں
خبر کیا تھی کوئی داؤ پہ اپنا گھر لگا دے گا

تجھے امید جب ہو گی ترا ہے منتظر کوئی
ترا جوشِ جنوں گلزار تجھ کو پر لگا دے گا

گلزار بخاری

کشمیر پر ایک نظم

خواب میں کشمیر ہے، تعبیر میں کشمیر ہے
قید لیکن نرغۂ تاخیر میں کشمیر ہے !

لمحہ لمحہ ایک دارو گیر میں کشمیر ہے
کیا خبر کس جرم کی تقصیر میں کشمیر ہے

روز آزادی کی اُمیدوں کو ہوتی ہے شکست
اب بھی ہم کو ہے یقیں، تقدیر میں کشمیر ہے

جُرمِ آزادی میں سب پیر و جواں ہیں قید میں
ان کی فرد جرم کی تعزیر میں کشمیر ہے

رہنماؤں کے سبھی وعدے بھی جھوٹے ہی رہے
قید اب تک حلقۂ زنجیر میں کشمیر ہے

وہ جو کہلاتی تھی کل تک وادیٔ جنّت نظیر
حیف، اب کس حالتِ دل گیر میں کشمیر ہے!

سامنے ملبہ ہے اور کشمیر کے مِٹتے کھنڈر
غور سے دیکھو تو کیا تصویر میں کشمیر ہے؟

فرض ہم اپنا نبھاتے ہی رہے ہیں آج تک
ہم قلم کاروں کی ہر تحریر میں کشمیر ہے !

کر رہے ہیں رہنما دعوے پچھتّر سال سے
جیسے اُن کے ناخنِ تدبیر میں کشمیر ہے

دیکھنا مُودی کے یہ مُوذی عزائم، دیکھنا!
جیسے اس کے باپ کی جاگیر میں کشمیر ہے

دیکھ کر کشمیر کا منظر یہ پوچھوں گا نسیم
واقعی کیا وادیِ کشمیر میں کشمیر ہے ؟

نسیم سحر

سامنے ریت ہی ریت ہے [اختر حسین جعفری کی یاد میں]

اور اب سامنے
ریت ہی ریت ہے
فصل کا ہے گُماں
یاس کا کھیت ہے

کالی پوشاک پہنے ہوئے ہیں سبھی
ٹوٹتی آس
اور سُونی راہ
گرد آنکھوں کے حلقے سیاہ

پیڑ کے کُنج میں
فاختہ بین کرتی ہوئی

تیرہ و منجمد دھار پر
ایک انگختی سا
سویرا کوئی
خوشبوؤں کی معیّت میں جاتا ہوا
جگنوؤں کا
بسیرا کوئی
آکسیجن کا ڈیرا کوئی

ضوفشاں
سچے حرفوں کی قندیل تھی
نظم کے موتیوں سے بھری
جھیل تھی
علم زنبیل تھی
اور اب سامنے
ریت ہی ریت ہے

خیمہ ءزرد ہے
وقت بیدرد ہے
آئینے پر پڑی گرد ہے
آنسوؤں کے سمندر میں بھیگی ہوئی
ریت ہے

اور اب سامنے
ریت ہی ریت ہے

تنویر قاضی

''ابھی محبت مری نہیں ہے''

گو بے یقینی کے دائرے میں
گھٹن زدہ تیرگی جمی ہے
کہیں کوئی حوصلہ نہیں ہے
کہیں کوئی روشنی نہیں ہے
میں جب خیالوں میں
تیری آنکھوں کی
مست جھیلوں کے پار اترا
تو میں نے دیکھا
کہ
مست جھیلوں کے پار
خوابیدہ ساحلوں پر
یقیں کے مہکے چراغ تھامے
کوئی مرا منتظر کھڑا ہے
تو میں نے جانا
یقیں ابھی سانس لے رہا ہے
ابھی محبت مری نہیں ہے

اوصاف شیخ

''کھڑکی سے جھانکتی نظم''

وحشت تو پھر وحشت ہے نا
وحشت کے آنے سے پہلے
یہاں کبھی
اک ہنستا بستا شہر تھا
جس میں
ہر موسم کے پھول اگتے تھے
خوشبو اڑتی پھرتی تھی
یوں لگتا تھا
تجھ سے ملنے جانے والے
ہر رستے پر پھول بچھے ہیں
رنگ سجے ہیں
اب تو جیسے شہر میں
بس اک میرا گھر ہے باقی
گھر بھی کیا ہے
جلتے بلتے صحرا میں
ایک کھنڈر ہے
جس کی
دیواریں خاموش کھڑی ہیں
دروازے پر چپ کا تالہ
روشن دان میں جالا
اور کھڑکی میں لوکا پہرہ
باہر نہ وہ پھولوں والے رستے ہیں
نہ خوشبو
حدِ نظر تک
روح جھلساتی ریت
جو کھڑکی سے ٹکرائے
تو لگتا ہے
جیسے کوئی جھانک کے
واپس لوٹ گیا ہے

حوالوں کی تجسیم

مجھے میرے آثار میں ڈھونڈتے ہو؟
عجائب گھروں میں،
شکستہ زمانوں کی بے آب تیغوں، زرہ بکتروں میں
مجھے ڈھونڈتے ہو
مجھے جن حوالوں سے تم جانتے ہو
وہ صدیوں پہ پھیلی ہوئی دھول میں اٹ چکے ہیں
انہیں مقبروں، معبدوں، خانقاہوں

پہ
جلتی اگربتیوں کے دُھویں میں کہاں ڈھونڈتے ہو
سیہ طاقچوں میں بھڑکتے چراغوں کی لو سے
مرا راستہ پوچھتے ہو

مجھے ڈھونڈنا ہے تو گھوڑوں کی ٹاپوں میں،
تیغوں کی جھنکار،
توپوں کی آواز میں مجھ کو ڈھونڈو
مجھے میرے زندہ حوالوں میں ڈھونڈو
عجائب گھروں میں لٹکتی ثقافت سے
میرا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے
کہ میرے حوالوں کی تجسیم ممکن نہیں ہے

فیاض تحسین

ابا جی

خدا کا اپنا سکہ ہے

خدا کی اپنی مرضی ہے
خدا ہر بات پر قادر
خدا ہے قادر مطلق
مشیت کے مطابق ہے یہی دستور قدرت کا
جسے آنا ہے اس کو لوٹ کر واپس بھی جانا ہے
یہی قانون فطرت ہے۔
پیمبر اولیا ابدال سارے تابع اس کے
سو اس کو جاننا اور ماننا بے حد ضروری ہے
مگر اب کیا کیا جائے
یہ دل کا زخم ایسا ہے
جسے ہم سی نہیں پاتے
تو ہرگز جی نہیں پاتے
کبھی ہم زندگی کا زہر ایسے پی نہیں پاتے

تصور کے نہاں خانوں میں
اک تصویر جگ مگ ہے
وہی چہرہ منور ہے
وہی صورت اجاگر ہے
جو آنکھوں سے نہیں جاتی
وہ لوح دل پہ کندہ ہے
اسی کی شکل کا ٹیٹو کھدا رکھا ہے آنکھوں نے

فصیل جسم و جاں میں ہر طرف وہ عکس روشن ہے
مرے اجزائے ترکیبی میں اس کا خون شامل ہے

نظر کے چوکھٹے میں ہے
وہ خلیات بدن میں ہے
وہ جزیات بدن میں ہے
وہ ہر شریان میں وجدان میں پل پل
دھڑکتا ہے
وہ شعلہ ہے جو آب و تاب سے مجھ میں بھڑکتا ہے
مسلسل رات دن مجھ پر عجب احساس طاری ہے
کہ جیسے قلب جاری ہے
اسی کے نام پر یہ زندگی ساری کی ساری ہے
وہ صورت گر وہ جادوگر
وہ جیسے دیوتا کوئی
وہی تعمیر کی صورت

وہی جاگیر کی صورت
مری تقدیر کی صورت
دل دلگیر کی صورت
اماوس کے دنوں میں بھی کسی مہتاب کی صورت
سنہرے خواب کی صورت
اسی کا عکس روشن ہے
وہی ماہ درخشاں ہے
وہی لعل بدخشاں ہے
ہے جنت ماں کے پاؤں میں
مگر وہ تاج ممتا کا
وہی سرتاج ممتا کا
وہی معمار میرا تھا
وہی معیار میرا تھا
جو پہلی سانس سے اب تک
مری نس نس میں رہتا ہے
مری رگ رگ میں بہتا ہے
مری تخلیق کا مظہر
سمندر وہ محبت کا
مرے ننھے بدن کو جس نے بانہوں میں سنبھالا تھا
مری تاریک راتوں میں وہی دن کا اُجالا تھا
جواں ہمت جوانی میں وہ کیا شعلہ جوالہ تھا

وہ مجھ پر جان دیتا تھا
مجھے پہچان دیتا تھا
پسینے پر مرے اپنا لہو تک وار دیتا تھا
وہ کانٹوں پر کھڑا مجھ کو گل و گلزار دیتا تھا
وہ سینے پر سلاتا تھا
حسیں سپنے دکھاتا تھا
وہ خود کھانے سے پہلے کس طرح مجھ کو کھلاتا تھا
مجھے بانہوں میں لے کر بارہا جھولا جھلاتا تھا
میرے چھوڑے ہوئے کھانے سے اپنا پیٹ بھرتا تھا
مرے بچپن میں یہ اکثر ہی میرا باپ کرتا تھا

مجھے انگلی پکڑ کر اس نے ہی چلنا سکھایا تھا
مجھے تھکنے سے پہلے اس نے کندھوں پر اٹھایا تھا
مجھے احساس ہی کب تھا کہ میرا باپ تھکتا تھا
مرے آرام کی خاطر اکیلا آپ تھکتا تھا
میں پہلوٹھی کا بیٹا تھا
میں اس کی آنکھ کا تارا
وہ اپنا خوں پسینہ رات دن مجھ پر بہاتا تھا
وہ میرے واسطے آنکھوں میں کیا سپنے سجاتا تھا
تبھی تو رستم و سہراب سے مضبوط لگتا تھا
خلوص اس کا بھلا کس بات سے مشروط لگتا تھا

نہاں خانہء دل میں ایسی تصویریں ہیں گنتی کی
غبارِ زندگی میں اٹ کے بھی دھندلی نہیں ہوتیں
ہمیشہ جگمگاتی ہیں ہمیشہ مسکراتی ہیں
مگر جب یاد آتی ہیں
تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
اسے مرنا پڑا آخر مجھے جینا سکھانے میں
قفس کو توڑ کر جانا پڑا مجھ کو اڑانے میں
کمال فکر و فن تجسیم کرنا جانتا تھا وہ
جنوں کی عشق کی تفہیم کرنا جانتا تھا وہ
ادب آداب کی تعظیم کرنا جانتا تھا وہ
خرد اور عقل کو تسلیم کرنا جانتا تھا وہ
تبھی تو روشنی تعلیم کرنا جانتا تھا وہ
زمیں پر
پیشۂ پیغمبری سے منسلک تھا وہ
معلم تھا معلم قوم کے بچے پڑھاتا تھا
مکمل طور پر اس کو یہی اک کام آتا تھا

چراغوں جگنوؤں سے رات میں سورج بناتا تھا
ابھی بھی عین ممکن ہے
وہ بیٹھا رفتگاں میں یہ ادھورا کام کرتا ہو
محبت عام کرتا ہو

وہ میرا باپ تھا انگلی پکڑ کر بارہا جس نے
مجھے چلنا سکھایا تھا
پڑھایا تھا لکھایا تھا
مجھے اچھی طرح وہ پہلا دن بھی یاد ہے اب تک
مجھے اسکول میں والد نے جب داخل کرایا تھا
پرانی سائیکل پر پیار سے آگے بٹھایا تھا
مرے ماتھے پہ اس دن کتنے ہی بوسے دیے اس نے
میں ایسا ننھا پودا تھا
جسے دن رات اپنے خون سے بابا نے سینچا تھا
خوشی اور غم میں سینے سے لگا کر مجھ کو بھینچا تھا
وسائل جتنے بھی محدود تھے لیکن کبھی اس نے
کہاں اس بات کا احساس بھی ہونے دیا مجھ کو
خوشی کے کب کسی تہوار پر رونے دیا مجھ کو
نئے کپڑے نئے جوتے
ابھی بھی یاد ہیں مجھ کو
وہ اکثر عید پر دھوئے ہوئے کپڑے پہنتا تھا
مگر میں عید والے دن
نہا کر جب نیا جوڑا نئے جوتے پہنتا تھا
تو مجھ کو دیکھ لینے سے ہی اس کی عید ہوتی تھی
جوانی میں تھا وہ کوہِ گراں جیسا قوی ہیکل
مگر سفاک ظالم وقت کی بے مہر موجوں نے

حوادث کے تھپیڑوں نے
جواں ہمت کی ہمت رفتہ رفتہ توڑ ڈالی تھی
جوانی نے مری اس کو بڑھاپے میں دھکیلا تھا
مشیت نے وہی صدیوں پرانا کھیل کھیلا تھا
دنوں کے بعد اس بوڑھے کے چہرے پر خوشی تب تھی
ملی تھی نوکری اس کے جواں بیٹے کو چھوٹی سی
قریب آتی ہوئی منزل ہو جیسے خود کفالت کی
وہی بیٹا جسے وہ اپنی بیساکھی سمجھتا تھا
مگر پھر اس جواں بیٹے کی شادی بھی ضروری تھی
سو اس نے آخری پونجی بھی اس پر خرچ کر ڈالی
مگر افسوس جب بچے ہوئے داخل جوانی میں
ذرا سی بہتری آنے لگی تھی
دانے پانی میں
بلاوا آ گیا اوپر سے تب کار مشیت کا
قضا تو ایک مہرہ ہے یہ سب مالک کی مرضی ہے
بہت بچپن میں میں جس باپ کے سینے پہ سویا تھا
وہ میرے سامنے جا کر منوں مٹی میں کھویا تھا
کمال ضبط سے میں نے اسے کندھوں پہ ڈھویا تھا
میں اسکو یاد کر کے اب بھی کتنی بار روتا ہوں
اکیلے میں کبھی پلکیں کبھی دامن بھگوتا ہوں
یہ ہونی ہے یہی تو ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہے
یقیناً ایک دن اس سے مرے بچے بھی گزریں گے
میں ایسی عمر میں ہوں جب مرے پوتے نواسے ہیں
مرے بچے ہی کیا بچوں کے بچے بھی اٹاٹے ہیں
مرے اندر بھی اک بچہ ابھی بچپن میں گم صم ہے
جو اپنے باپ کی برسی پہ اس کو یاد کرتا ہے
عزاداری سے اشکوں سے یہ دل آباد کرتا ہے
خدا کا اپنا سکہ ہے خدا کی اپنی مرضی ہے
خدا ہر بات پر قادر
خدا ہے قادر مطلق
مشیت کے مطابق ہے یہی قانون۔قدرت کا
جسے آنا ہے اس کو لوٹ کر واپس بھی جانا ہے

مسعود احمد

''پردیس میں عید''

برسوں کا ارمان تھا دل میں
دوسرے دیس میں جاؤں گا میں
پیسہ خوب کماؤں گا میں
چھوٹے چھوٹے سپنے اکثر
بہنیں دیکھا کرتی ہیں جو
اُن سب کی تعبیر کروں گا
سوچوں کو تصویر کروں گا
جتنی غربت ماں نے دیکھی
اک دن ساری دور کروں گا
جیون کو مسرور کروں گا
مہنگائی کے بوجھ سے اب تو
بابا جانی کے بھی شانے
کیسے جھکتے جاتے ہیں وہ
اُن کا بوجھ اُٹھاؤں گا میں
پیسا خوب کماؤں گا میں
دوسرے دیس میں آ کر سمجھا
دیس کی خوشبو کیا ہوتی ہے
ہجرت ایک سزا ہوتی ہے
کس کو اب یہ بات بتاؤں
کس کو دل کا حال سناؤں
ماں بن ایک مہینہ میں نے
کیسے رو رو کر کاٹا ہے
اُس پر ایک ستم یہ دیکھو
عید بھی سر پر آ پہنچی ہے
دوسرے دیس میں آ کر کیسے
پہلی عید مناؤں گا میں
بابا جانی دور بہت ہیں
کس کو گلے لگاؤں گا میں
چھوٹی بہنا، میرا رستہ دیکھتی ہوگی
آپی جان بھی شاید اب تو
ہر سو مجھ کو ڈھونڈتی ہوگی
کتنے کام ادھورے اُس کے
میرے بن اب کون کرے گا
ماں کی خالی گود رہے گی
سر رکھ کر اب کون بھرے گا

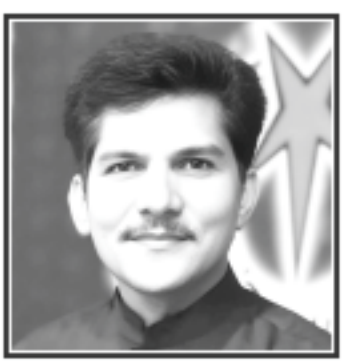

ارشد محمود ارشد

تین مختصر نظمیں

(۱) محبت کے چھلکے

جس درخت پر پھل نہیں لگا
ہوا نے اسے بھی چھوا
پھر باغ سے
محبت کے چھلکے ملے
اور زخم
تازہ ہوئے

(۲) بیگانگی

بھاگ دوڑ
شور شرابے سے
تنہائی موصول ہوئی
اب آئینے کے سامنے
کوئی اور کھڑا
کسے دیکھتا ہے

(۳) توازن

ہم
ایک ٹانگ پر
کتنی دیر کھڑے ہوں گے
شاید ساری زندگی
ہم دو ٹانگوں سے
کتنا چل سکتے ہیں
شاید ایک لمحہ

امجد بابر

نیلے آسمان پر اڑتی تتلی (نثری نظم)

یہ تتلیاں جو ہوا کے سنگ اڑتی ہیں،
یہ پھول جو رنگوں کا سمندر بچھاتے ہیں،
سب تمہاری یاد کے آنگن میں کھلتے ہیں۔
جب سورج سنہری کرنوں کو بکھیرتا ہے،
مجھے لگتا ہے
یہ روشنی تمہاری مسکراہٹ کا عکس ہے۔
ہر گلابی کلی میں تمہاری حیا چھپی ہے،
ہر نازک پنکھڑی میں تمہاری نرمی۔
اور نیلے آسمان پر اڑتی تتلی
جیسے تمہاری آنکھوں کی چمک
میری سانسوں کو چھو رہی ہو۔
میرے دل کے باغ میں
تمہارے نام کا ایک پھول کھلا ہے،
جس کی خوشبو وقت کو بھی روک لیتی ہے،
اور جس پر اترتی ہر تتلی
تمہاری محبت کا پیغام لاتی ہے۔
یہ منظر، یہ بہار، یہ رقصِ رنگ
سب گواہ ہیں
کہ میری زندگی کے ہر موسم میں
تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے۔
میرا ہر خواب،
میرا ہر لمحہ،
میرے دل کی ہر دھڑکن
تمہارے نام سے روشن ہے۔

اور شاید محبت کی اصل تعبیر یہی ہے
کہ انسان دنیا کے ہجوم میں بھی
صرف ایک وجود سے وابستہ ہو جائے
اس طرح
جیسے دعا اپنی قبولیت سے،
جیسے روشنی اپنے چراغ سے،
اور جیسے میری تمام کائنات
صرف تم سے

سید فرخ رضا ترمذی

ادراک (نثری نظم)

اب مجھے خود پر رحم نہیں آتا
خود ترسی کی کیفیت نے مجھے نگل لیا تھا
اداسی میرے ساتھ بوڑھی ہو چکی ہے
اب اسکی لاٹھی کی آواز
میری سماعتوں کو بھلی لگنے لگی ہے
خامشی کانوں میں رس گھولتی ہے
گریز کڑوا نہیں لگتا
زبان کو زہر بھرے لہجوں کا ذائقہ بھانے لگا ہے
مجھے خود سے لڑنا اچھا لگتا ہے
زخم زخم وجود میں درد کی لہریں
من کو اشانت رکھتی ہیں
یاد ملنے بھی آئے اسے دروازہ بند ملے گا
فراموشی کا قفل لگا کر
میں نے چابی
نسیان کے سمندر میں پھینک دی تھی
اب اداسی گھر میں پھلتی پھولتی
اور تنہائی گنگناتی ہے

نائلہ راٹھور

''چلے بھی آؤ''

میں ڈھلتے سورج کی سرخیوں میں
اداس شاموں کی وسعتوں میں
غموں میں ڈوبے
اداس لمحوں کو دیکھتی ہوں
دکھوں کے بارے میں سوچتی ہوں
میں دیکھتی ہوں
گلاب جیسے مرے بدن میں
تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے

وفا کی کومل سی تتلیاں بھی
اداس گلشن میں سانس لیتی اڑانیں بھرتی
تمہارے آنے کی آس تھامے
مچل رہی ہیں
نظر تمہاری ہی رہگذر میں بچھی ہوئی ہے

چلے بھی آؤ
سنہری زلفوں میں پھول کوئی سجاؤ آ کر
اداس دل میں امنگ کوئی جگاؤ آ کر
گلاب جیسے مرے بدن میں
تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے

رابعہ رحمان

نہ جانے کس سمت کھو گیا ہے

[سرفراز تبسم کی حادثاتی موت پر]

خالق آرزو

نہ جانے کس سمت کھو گیا ہے

وہ میری سوچوں کی ٹہنیوں پر

مہکنے والا!

بہار موسم میں وہ پپیہا

چہکنے والا

بڑی خموشی سے

ان کہے راستوں کی تیرہ نصیبوں میں

بکھر گیا ہے

ہماری بے جان دسترس کی حدوں سے باہر

وہ موت کی بے چراغ بستی کی گھاٹیوں میں

اتر گیا ہے

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کسی طرح نہ مرے دل کا قفل کھل پایا
ہوا نہ مجھ سے اِسی ایک درد کا چارا

نظم

عائشہ احمد جاوید

جا بجا جو نظر آئے تیرے جلوے
اب اس محبت کا احتساب نہیں ہوگا
جا اب ہم سے تیرا انتظار نہیں ہوگا

میں نے مان لیا تو ہے بے شمار ہے
اب اس ادراک کا الہام نہیں ہوگا
جا اب ہم سے تیرا انتظار نہیں ہوگا

یہ سودے بازی ہے یا محبت ہے
ترازو انصاف کا کس کے ہاتھ میں ہوگا
جا اب ہم سے تیرا انتظار نہیں ہوگا

یہ راستے آشنا ہیں انھیں غور سے دیکھ
کیا بندگیوں میں کبھی منزل کا گمان ہوگا
جا اب ہم سے تیرا انتظار نہیں ہوگا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد اگر آنکھیں نہیں ، دامن ہی بچھا دے
اَب چھت سے اُترنے کو یہ سنسان سا دن ہے

دُھن

محمد عبداللہ

اپنے ہدف سے
یکدم
پیچھے ہٹ جانا
بزدلی نہیں ہوتا
البتہ صحرا میں کھڑے ہو کر
دوست اور دشمن کی پہچان
کے درمیان پھنس جانا
کبھی کبھی
اپنے اصل مقصد کی حدود کے در
بند کر سکتا ہے
جبکہ دُھن کا پکا مسافر
اپنی مراد کو پا لیتا ہے
کوشش
اور بلند حوصلے سے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچو تو کچھ نہ سمجھو، سمجھو تو کچھ نہ بولو
پھر چپ کا حسن دیکھو، بیکار لب نہ کھولو

اگر (نثری نظم)

اگر سب بالکل ٹھیک ہے
تو تمہاری ہنسی سے خاموشی کیوں پھوٹ رہی ہے؟
تم خود پر فرضی قہقہوں کے پہاڑ کیوں گراتے رہتے ہو؟

اگر سب بالکل ٹھیک ہے
تو تم کمرے سے نکل کر دوستوں کے ساتھ گھومنے کیوں نہیں جاتے؟

کنگھی کرتے ہوئے تمہارے سر سے بالوں کی جگہ دن کیوں جھڑتے ہیں؟
اگر سب بالکل ٹھیک ہے

اگر سب بالکل ٹھیک ہے
تو پینٹنگ میں بھوک سے بلکتے ہوئے بچے کے لیے

تمہاری انگلیوں سے دودھ کیسے رسنے لگتا ہے؟
تم کسی بھی لمحے

کسی آہ کے ساتھ اڑ کر کبوتر میں کیوں بدل جاتے ہو
جس پہ شکاری نشانہ باندھے ہوئے ہو؟

یا کوئی بھی چیخ تمہیں پاگل بیل کی کھونٹی بنا کر
زمین میں کیوں دھنسا دیتی ہے؟

اگر سب ٹھیک ہے
تو تم پر اپنا سر بھاری کیوں ہے؟

اور تم سر پر چلنے کی مشق کیوں کر رہے ہو؟

نسیم خان

ہر شعر زندگی ہے
باقی احمد پوری

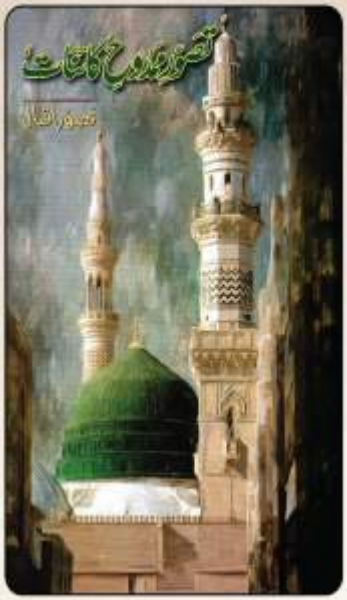

آسمان کا تیسرا کونہ

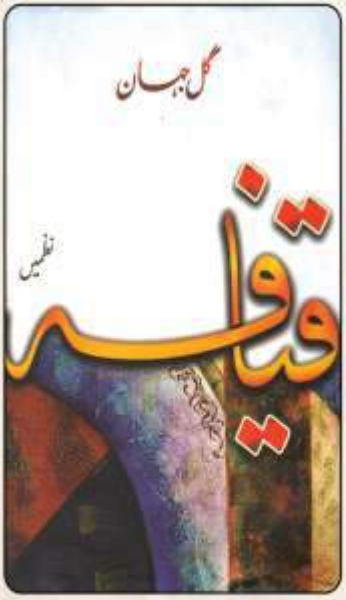

گل جہان
نظمیں

جناب خالد احمد کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر